کتب خانہ نعیمیہ دیوبند

عصمتِ انبیاء اور مولانا مودودی

عقل و نقل کے آئینے میں

از

حضرت مولانا سید طاہر حسین صاحب گیاوی مدظلہ

ناشر

کتب خانہ نعیمیہ دیوبند

تفصیلات

نام کتاب — عصمت انبیاء اور مولانا مودودی عقل و نقل کے آئینے میں۔

مؤلف — مولانا سید طاہر حسین صاحب گیاوی مدظلہ

ناشر — کتبخانہ نعیمیہ دیوبند (یوپی)

بار اشاعت — چوتھا ایڈیشن سنہ ۱۳۹۸ھ

ملنے کے پتے

دار العلوم حسینیہ ڈنڈیلہ کلاں پوسٹ رہلا ضلع پلاموں (بہار)

مکتبہ حلیمی لبوکھر پوسٹ باراہاٹ ضلع بانکا

مولانا عزیز احمد حلیمی قاسمی مقام و پوسٹ سمریا ضلع بھاگل پور

مولوی سید عبید اللہ مرغوب مقام سرکی چک پوسٹ سندلیش ضلع بھوجپور (بہار)

حرفِ آغاز

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم، امّا بعد:-

ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں، ان سے کوئی گناہ صغیرہ و کبیرہ صادر نہیں ہوا، نبوت سے قبل بھی عصمت کی دولت سے مالا مال رہے، اور نبوت کے بعد بھی، تاکہ وہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے امت پر پیش کریں، امت اس پر پورے یقین کے ساتھ عمل کرے اور وہ کسی شک و شبہ میں مبتلا نہ ہونے پائے۔

لیکن جہاں بہت سے مسائل میں ملحدوں نے شکوک و شبہات پیدا کر کے اپنی عاقبت برباد کی ہے، اسی طرح عصمتِ انبیاء علیہم السلام کے مسئلہ میں بھی یہ لکھ کر کہ عصمتِ انبیاء کرام کے لئے لازم نہیں ہے، اپنی عاقبت خراب کی ہے۔

سب سے پہلے احمد امین مصری نے اپنی کتاب ضحی الاسلام میں لکھا کہ یہ مسئلہ علماء اہلِ سنت کا ایجاد کردہ ہے پھر ویسا سے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی بھی متاثر ہوئے اور انہوں نے بھی انبیاء کرام کے معصوم ہونے کا انکار کیا اور اپنی کتابوں میں اس مسئلہ پر قلم فرسائی کی۔

ضرورت تھی کہ اس مسئلہ پر کتاب و سنت کی روشنی میں بتایا جائے کہ

عصمتِ انبیاء کرام کا مسئلہ عہد صحابہ کرام سے آج تک مسلم چلا آرہا ہے اور اہلِ سنت والجماعت بھی اس کے منکر نہیں ہیں ہے ۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے سلطان المناظرین حضرت الحاج مولانا سید طاہر حسین صاحب گیاوی مدظلہ العالی بانی و مہتمم دار العلوم حسینیہ پلاموں کو کہ انہوں نے اس مسئلہ پر کتاب و سنت کی روشنی میں پوری بحث کر کے ثابت کیا کہ انبیاء کرام معصوم ہیں ۔ یہ کتاب آیات قرآنی اور احادیث کے حوالجات سے مزین ہے ۔ مولانا موصوف نے کافی محنت کی ہے اس کتاب کے پڑھنے سے اندازہ ہوگا کہ ملحدین نے کہاں کہاں دھوکہ کھایا ہے ۔ اور کس کس طرح غلط استدلال کیا ہے ۔

مختصر یہ کہ کتاب مسلمانوں کے لئے مفید ہے اور اس کا مطالعہ ضروری ہے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی اصلاح فرمائے جن کیلئے کتاب لکھی گئی ہے ۔

محتاج دعاء
محمد زاہد علیمی قاسمی بھاگلپوری

ا رجمادی الاول ۱۳۹۸ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید

المرسلین وعلیٰ اصحابہ واتباعہ اجمعین ط

زیر نظر کتاب کی ترتیب سے بہت پہلے سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے
متعلق میرے علم میں یہ بات آچکی تھی کہ وہ اپنی آزاد خیالی کی وجہ سے
بعض عقائد میں اہلسنت والجماعت کے طریقے سے ہٹ گئے ہیں اور
یہ بات بھی سنا کرتا تھا کہ جو لوگ ان کے نظریات سے متفق ہیں خصوصاً
جماعت اسلامی کے بارے میں بھی یہ بات سننے میں آچکی تھی کہ وہ اپنی تمام تر
فکری اور عملی سرگرمیوں میں مودودی صاحب کے افکار و خیالات کی پابند
ہے اس لئے یہ جماعت کتاب و سنت کی متوارث شاہراہ سے الگ ہو چکی
ہے لیکن ان سب کے باوجود کوئی ایسا بنیادی اختلاف جو کتاب و سنت کی
روشنی میں کھلی گمراہی اور زیغ و ضلال سے تعبیر کیا جا سکے میں اپنے طور پر
محسوس نہیں کر پاتا تھا جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مودودی صاحب اور ان
کی جماعت کے متعلق اپنا ذاتی مطالعہ کوئی خاص نہ تھا لیکن بعض رسائل
اور مضامین کے ذریعے یہ خیال پیدا ہو چکا تھا کہ مودودی صاحب کے
افکار و خیالات اچھے نہیں ہیں تاہم بدگمانی اس درجے کی نہ تھی کہ جسے ان
کے مخالفین کی تائید کہا جا سکے مگر خدا بھلا کرے مجلس تحفظ و تحقیق سراجیہ

ضلع اعظم گڑھ کا جس نے دینی عقائد کے ایک اہم مسئلے پر ایک کتابچہ شائع کیا۔ اتفاق سے وہ کتابچہ میری نگاہ سے بھی گذرا اس کے اندر عصمتِ انبیاء کے متعلق رد و مقابل تحریروں کا جائزہ لیکر صحیح رائے کی نشاندہی کی گئی تھی پھر اس رسالے کے جواب میں کچھ کتابچے بھی شائع ہوئے اس طرح کتابی سوال و جواب کا ایک سلسلہ قائم ہوگیا جس کی وجہ سے مجھے بھی یہ خواہش ہوئی کہ مسئلے کی اصل حقیقت معلوم کرنی چاہیئے چنانچہ میں بھی اس کی تحقیق میں لگ گیا بہا قی محنت اور تحقیق و جستجو کے بعد میں جس نتیجہ پر پہونچا ہوں اس کو تفصیل کے ساتھ زیرِ نظر کتاب کے ذریعہ ناظرین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں تاکہ دینی عقائد کے معاملے میں مودودی صاحب اور ان کی جماعت کے افکار و خیالات کی کمزوریاں میری طرح دوسرے بھائیوں کے سامنے آجائیں اور پھر انھیں بھی ان کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے کا موقع مل سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ انبیاء کرام کی عصمت کے مسئلے میں گمراہی کی ابتدا مودودی صاحب نے خود نہیں کی ہے بلکہ انھوں نے یہ نظریہ دوسری جگہ سے اخذ فرمایا ہے۔

ماضی قریب کے ممتاز مصری — عصمتِ انبیاء کے سلسلے میں احمد امین مصری کی تحقیق

علماء اور مشہور انشا پردازوں میں احمد امین مصری کا نام محتاج تعارف نہیں ہے انھوں نے اپنی کتاب "ضحی الاسلام" کے تیسرے جز میں عصمت

انبیاء کے مسئلے پر بحث کی ہے چنانچہ انہوں نے بڑی جرأت و بیباکی سے کام لیتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ عصمت انبیاء کا یہ عقیدہ شیعوں کے رد عمل میں اہلسنت کے اندر پیدا ہوا ہے ورنہ صدر اول اور دور سلف میں اس عقیدے کا ہرگز وجود نہ تھا فرماتے ہیں۔

بل ولا نعرف وصف العصمة الذی للانبیاء فی بعض النصوص وجاء فی الکریم لا یثبتونها دعوی العصمة لاحد من الناس (ضحی الاسلام جزء ثالث ص ۲۲۹)

بلکہ ہم کو تو اس دور یعنی صدر اول میں اس بات کا پتہ بھی نہیں ملتا ہے کہ انبیاء کرام کیلئے عصمت ثابت کی گئی ہو؟ قرآن کریم کی رو سے تو کسی شخص کے لئے عصمت کا دعویٰ سمجھ میں نہیں آتا۔

یعنی احمد امین کے خیال میں یہ عقیدہ صریح قرآن کے خلاف ہے اور اس کا وجود صدر اول کے بعد شیعوں کے عصمت ائمہ کے رد عمل میں ہوا ہے اس کے بعد احمد امین صاحب نے تقریباً بارہ آیتیں منتخب کر کے اس بات کی دلیل میں پیش کیا ہے کہ یہ آیتیں عصمت انبیاء کے عقیدے سے انکار کرتی ہیں ان میں سے بعض آیتوں پر آئندہ صفحات میں تبصرہ کیا جائے گا۔

اس وقت احمد امین کے استدلال کی حقیقت ناظرین کے سامنے آ جائے گی تفصیلی معلومات کے لئے ان آیتوں کی تفسیر کا یہ اہل سنت

کی کتابوں میں دیکھنی چاہئے تاکہ احمد امین کی مریضانہ ذہنیت اور غلط فہمیوں کا پوری طرح اندازہ ہو سکے۔ بہرحال احمد امین صاحب نے اس خیال کا بار بار اعادہ فرمایا ہے کہ عصمت انبیاء کا عقیدہ صدر اول کے بعد محض شیعوں کی تقلید میں علماء اہلسنت نے ایجاد کیا ہے چنانچہ اس بات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

واغلب الظن ان بحث المتكلمين في عصمة الانبياء متاخر عن قول الشيعة بعصمة الامام في الاسلام	غالب گمان یہ ہے کہ متکلمین کا عصمت انبیاء کے مسئلے میں بحث کرنا عصمت ائمہ کے عقیدے کے بعد وجود میں آیا ہے۔

اپنے اس دعویٰ پر احمد امین صاحب نے کوئی ٹھوس ثبوت پیش نہیں کیا ہے بلکہ اپنے دعویٰ کے ثبوت کے لئے انھوں نے تاریخی اسباب و وجوہ کے ذریعہ ظن و تخمین سے استدلال کرنے کی کوشش کی ہے۔ پوری بحث کا خلاصہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

فكان المتكلمون اذا رأوا الشيعة ينسبون هذه العصمة لائمتهم نسبوا مثلها للانبياء على الاقل فغلا بعضهم في القول بعصمة الانبياء من الكبائر والصغائر قبل النبوة وبعدها	تو اہل سنت نے جب یہ دیکھا کہ شیعہ حضرات ہر فضل و کمال کو کسی نہ کسی امام سے منسوب کر رہے ہیں تو انھوں نے بھی کم از کم انبیاء کرام سے متعلق ویسے ہی عقیدے بنا لئے حتیٰ کہ بعض سنیوں نے

وھو مخالف لصریح القرآن (ضحی الاسلام صفحہ ۲۳۵/۳۶)

انہیں اس قدر غلو کیا کہ وہ انبیاء علیہم السلام کے حق میں جملہ صغائر و کبائر سے بعد نبوت اور قبل نبوت عصمت حاصل ہونے کے قائل ہو گئے حالانکہ یہ نظریہ صریح قرآن کے خلاف ہے۔

احمد امین صاحب نے اپنے اس خیال کی حمایت میں اکابر اہل سنت کی کتابوں سے نہ تو کوئی تائید حاصل کی ہے اور نہ ہی اسلامی کتب خانے کے ذخیرے میں تلاش و جستجو کے باوجود کوئی سہارا دستیاب ہو سکا ہے البتہ امام غزالیؒ کی ایک عبارت بے موقع نقل کر کے اس سے اپنا عقیدہ کشید کرنا چاہا ہے۔ امام غزالیؒ کی عبارت سے جو کچھ انھوں نے سمجھنا چاہا ہے اس پر تبصرہ کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم ان کے اس نظریئے کا جائزہ لیں کہ اس عقیدے کے بارے میں ان کا یہ بیان کہاں تک صحیح ہے کہ یہ عقیدہ صریح قرآن کے خلاف بھی ہے اور صدر اول کے بعد ایجاد کیا گیا ہے

عصمت انبیاء کا عقیدہ صدر اول سے متوارث ہے

یہ کہنا کہ صحابہ کرامؓ کے دور میں انبیاء کرام کے لئے عقیدۂ عصمت کا پتہ نہیں ملتا ہے۔ مذہبی تاریخ اور سیر کی کتابوں سے کامل بے خبری کی دلیل ہے اس لئے کہ اسلامی فرقوں کے نظریاتی اختلاف کی تاریخ پر غور کرنے سے یہ بات واضح

طریقہ پر سامنے آجاتی ہے کہ اس عقیدے کا صحابۂ کرام کے زمانے میں وجود تھا جیسا کہ آئندہ صفحات میں اس کی تفصیل پیش کی جائے گی۔

اس بات کا تاریخی ثبوت موجود ہے

قرآن و حدیث سے قطع نظر کرکے محض تاریخ کی روشنی میں بھی ہم تلاش و جستجو کریں تو یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتی ہے کہ یہ عقیدہ صحابہؓ کے درمیان اور ان کے بعد تابعین کے زمانہ میں بھی موجود تھا چنانچہ فرقۂ ازارقہ جو خوارج کا ایک گروہ ہے اس کے متعلق علامہ آلوسی علیہ الرحمۃ کے حوالے سے یہ بات آچکی ہے کہ جمہور امت سے عصمت انبیاء کے مسئلے میں ازارقہ کو اختلاف تھا اور یہ فرقہ زمانۂ رسالت و نبوت میں بھی انبیاء کو کفر و شرک سے معصوم نہیں تسلیم کرتا ہے بلکہ علامہ شہرستانی نے اپنی مشہور کتاب "الملل والنحل" کے اندر تحریر فرمایا ہے کہ فرقۂ ازارقہ صغائر و کبائر میں سے کسی گناہ سے بھی انبیاء کرام کے لئے عصمت کا قائل نہیں ہے۔ اب ایک بات یہ رہ جاتی ہے کہ یہ فرقہ کس دور میں پیدا ہوا اس کی تاریخ ولادت معلوم ہو جانے کے بعد یہ چیز خود سمجھ میں آجائے گی کہ عصمتِ انبیاء کا عقیدہ صدر اول میں موجود تھا کہ نہیں۔ اگر یہ بات مستند طریقے سے ثابت ہو جاتی ہے کہ فرقۂ ازارقہ صحابہ ہی کے دور میں پیدا ہو چکا تھا اور اسی نے جمہور امت کے خلاف

عصمتِ انبیاء کا انکار کیا ہے تو پھر اس بات کے لئے کوئی وجہ جواز باقی نہیں رہ جاتی کہ احمد امین مصری کا سابق خیال درست تسلیم کر لیا جائے۔ فرقہ ازارقہ کی بنیاد نافع بن ازرق نے ڈالی ہے۔ تاریخوں سے یہ حقیقت بے غبار ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ اس فرقہ کا بانی اور سربراہ اول یہی شخص تھا چنانچہ تذکرہ نگار لکھتے ہیں۔

هو نافع بن الأزرق الحروري من رؤس الخوارج وإليه تنسب طائفة الأزارقة قتل في جمادى الآخرة سنة ٦٥ه وله أسئلة عن ابن عباس في جزء أخرج الطبراني بعضها في مسند ابن عباس من المعجم الكبير (حاشيه الفوز الكبير صفحہ ۱۱)

یہ نافع ابن ارزق حروری خارجیوں کا راس رئیس ہے اور فرقہ ازارقہ اسی کی طرف منسوب ہے۔ جمادی الاخریٰ ۶۵ھ میں قتل کیا گیا۔ حضرت ابن عباسؓ اور اس شخص کے درمیان کچھ سوال و جواب بھی ہوئے ہیں جن کا بعض حصہ طبرانی نے معجم کبیر میں مسند ابن عباسؓ کے ذیل میں نقل کیا ہے۔

اس عبارت سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتی ہے کہ فرقہ ازارقہ صحابہ کرامؓ کے زمانے میں ہی رونما ہو چکا تھا پھر اس کے بعد احمد امین مصری کا یہ کہنا کہ عصمتِ انبیاء کا نظریہ صحابہؓ کے دور میں نہ تھا۔ مختلف اسلامی فرقوں کے عقائد اور ان کے صحیح تاریخی حالات سے بےخبری کا نتیجہ نہیں تو اور

کیا ہے اگر ہم بفرضِ محال یہ بات بھی تسلیم کر لیں کہ خاص بانیٔ فرقہ کی طرف
سے عصمتِ انبیاء کے مسئلے میں دورِ صحابہؓ کے اندر یہ اختلاف رونما نہیں
ہوا تھا بلکہ بعد میں بانیٔ فرقہ کے متبعین نے یہ اختلاف پیدا کر لیا تھا تو اس
کے باوجود دورِ صحابہ میں اس عقیدے کے موجود ہونے کا ثبوت فراہم
ہو جاتا ہے کیونکہ بانیٔ فرقہ اور اس کے متبعین کی مدتِ حیات کے بارے
میں جو کچھ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے ان سب کا حاصل یہی ہے کہ یہ فرقہ
زیادہ دن تک باقی نہیں رہ سکا اور قلیل عمری ہی میں اس فرقے کا خاتمہ
ہو گیا۔ اس تاریخی شہادت کے علاوہ خود یہ بات بھی غور کرنے کی ہے
کہ فرقے کا بانی اول نافع بن ازرق ہے جس کی تاریخ انتقال جمادی الاخری
۶۵ھ بتائی گئی ہے۔ اور صحابۂ کرام کا زمانہ کم از کم سو سال یعنی پہلی صدی
ہجری تک تسلیم کرنے سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ سوچنے کی بات ہے
کہ اس قلیل العمر فرقے کے بانی نے اگر یہ اختلاف اپنی حیات کے اندر نہ
پیدا کیا ہو بلکہ اس کے متبعین نے عصمتِ انبیاء کے عقیدے سے اختلاف
ظاہر کیا ہو جب بھی نصف صدی سے کچھ کم کا لمبا عرصہ اس کے متبعین
کو ملتا ہے جس کے اندر اس اختلاف کا ظاہر ہو جانا نہ صرف قرین
قیاس بلکہ ایک یقینی امر ہے بنا بریں فرقۂ ازارقہ کا عصمتِ انبیاء کے
مسئلے میں جمہور صحابہ سے اختلاف کرنا ایک تاریخی حقیقت ہے۔

جس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ جمہور امت اور تمام صحابہؓ اگر
اس وقت عصمتِ انبیاء کے قائل نہ ہوتے تو فرقہ ازارقہ کا اس سے
اختلاف کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا اور نہ مورخین کو اس اختلاف کے
نقل کرنے کی کوئی ضرورت ہی پیش آتی لیکن اسلامی فرقوں کے نظریاتی
اختلاف کی تاریخ میں اس فرقہ کا اس انداز میں تذکرہ پایا جانا اس کی واضح
دلیل ہے کہ یہ فرقہ اس نظریئے کی وجہ سے امت کی عام فضا سے چونکہ
ہٹ چکا تھا اس لئے تاریخ نے اس فرقے کے عصمتِ انبیاء کے عقیدے
سے اختلاف کرنے کو محفوظ کر لیا ہے پس تاریخ کے اس تفصیلی بیان کے
بعد یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ عصمتِ انبیاء کا یہ عقیدہ صدرِ اول
میں موجود تھا اور اس زمانہ میں جمہور امت کا یہی عقیدہ تھا۔

اس بات کا قرآن و حدیث سے بھی واضح ثبوت ملتا ہے

قرآن کی بعض
آیات خاص عصمتِ انبیاءؑ کے مسئلہ میں بالکل صریح ہیں اور وہ اپنے
مفہوم و مراد میں بہت زیادہ واضح ہیں جن کا تذکرہ اپنے موقعہ پر آئندہ
صفحات میں آ رہا ہے لیکن ان آیتوں کے علاوہ کچھ ایسی آیتیں بھی ہیں
جن سے بطور اشارہ اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ یہ عقیدہ صحابہ کرام کے
نزدیک بھی موجود ہے مثلاً حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق قرآن میں ہے۔

فظن ان لن نقدر علیہ ؔ — انھوں نے خیال کیا کہ ہم مواخذہ نہ کریں گے۔

یعنی حضرت یونس علیہ السلام نے اپنی سرکش قوم سے تنگ آکر یہ طے کر لیا کہ اب ان کے درمیان قیام نہ کرنا چاہیئے اور انھوں نے اس کے قبل ہی اپنی قوم کو چھوڑ دیا کہ اس سلسلے میں انھیں خدا کی طرف سے کوئی حکم ملتا۔ انھوں نے خیال کیا کہ ہمارا یہ قدام بُرے لوگوں سے بیزاری اور برأت ظاہر کرتا ہے اس لیئے اس پر کسی مواخذہ کا امکان نہیں ہے۔ یہی واقعہ کی طرف مذکورہ آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

پس لفظ نقدر نحکم کے معنی میں ہے لیکن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے نقدر کو قدرت سے ماخوذ سمجھا جس کی وجہ سے آیت کا یہ مفہوم ہو گیا کہ حضرت یونسؑ نے خیال کر لیا کہ اللہ تعالیٰ ہم پر قدرت ہی نہیں رکھتے ظاہر ہے کہ کسی پیغمبر کے بارے میں اس عقیدے کا تصور کرنا کہ وہ کسی موقعے پر بھی اپنے آپ کو خداوند تعالیٰ کی قدرت سے باہر سمجھتے ہوں سراسر ان کی عصمت کے منافی ہے۔ چنانچہ حضرت معاویہؓ کے ذہن میں فوراً یہ اشکال کھٹکنے لگا کہ یہ معنی جو آیت کے ظاہری الفاظ سے سمجھ میں آتا

لہ اس آیت کو احمد امین مصری نے عصمت انبیاء کے خلاف پیش کیا ہے۔ جواب حضرت ابن عباس کی وضاحت سے ظاہر ہے۔

انبیاء کرام کی عصمت کے سراسر خلاف ہے چنانچہ اس شبہے کی وجہ سے بعض بڑی بے چینی ہوئی وہ حضرت ابن عباس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا شبہ ان کے سامنے پیش فرمایا۔ حضرت ابن عباس نے وضاحت فرمائی کہ اس آیت کے اندر لفظ "نقدر" قدرت سے مشتق نہیں ہے بلکہ اس کا ماخذ قدر ہے جو تنگی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اس لیے آیت کا مفہوم انبیائے کرام کی عصمت کے منافی نہیں ہے اس واقعے میں اس بات کا واضح ثبوت موجود ہے کہ انبیاء کرام کی عصمت کا عقیدہ جمہور صحابہ میں معروف اور مسلم تھا ورنہ حضرت معاویہؓ کا شبہ کرنا اور اس کے ازالہ کے لئے اس قدر فکر مند ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا اور نہ حضرت ابن عباسؓ کے اس توضیح و وضاحت کی کوئی ضرورت پیش آتی۔ یہ واقعہ روح المعانی اور دوسری تفسیروں میں موجود ہے۔ تفسیر مدارک کے اندر مندرجہ ذیل الفاظ میں واقعہ کا تذکرہ ملتا ہے۔

عن ابن عباس رضی اللّٰہ عنھما	حضرت ابن عباس سے منقول ہے کہ
انہ دخل یوما علیہ معاویۃ	ایکدن حضرت معاویہؓ ان کے پاس
وقال لقد ضربتنی امواج	تشریف لائے اور کہنے لگے گذشتہ
القرآن البارحۃ فغرقت فیھا	رات میں قرآن کی موجوں کے نرد
فلم اجد لنفسی خلاصا الا بك	میں پڑکر ایک غرق ہوگیا بس تیرے

وقال وما هي يا معاويه فقرأ الآية فقال او يغفل نبي الله ان لا يعلم وقال هذا من القدر ولا يسمى القدر قدر من القدرة

لئے آپ کے سوا اس سے نجات کی کوئی راہ نہیں پاتا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ وہ تو کیا ہے پھر حضرت معاویہؓ نے آیت پڑھکر سوال پیش فرمایا کہ کیا رسول یہ تصور کر سکتا ہے کہ وہ خدا کی تقدیر سے باہر ہے؟ حضرت ابن عباسؓ نے ارشاد فرمایا اس آیت میں لفظ تقدیر قدر سے ماخوذ ہے قدرت سے نہیں۔

نیز اس عقیدہ سے متعلق جہاں تک احادیث کا تعلق ہے تو احادیث میں اس بات کا بڑا ذخیرہ موجود ہے کہ جس سے براہ راست عصمت انبیاء کے عقیدے پر روشنی پڑتی ہے اور اس امر کا واضح ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ تمام صحابہ کرام انبیاء علیہم السلام کی عصمت کا عقیدہ رکھتے تھے اس سلسلہ کی بعض حدیثیں اپنے موقعہ پر نقل کی جائیں گی۔ یہاں صرف ایک حدیث نقل کی جاتی ہے جو اس عقیدے پر پوری صراحت سے دلالت کرتی ہے۔ مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ کی فصل اول میں بخاری ومسلم کے حوالے سے یہ حدیث مذکور ہے

عن انس قال جاء ثلثة رهط الى ازواج النبي صلى الله عليه

حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ تین آدمی حضور اکرمؐ کی

يسئلون عن عبادة النبي
صلى الله عليه وسلم فلما
أخبروا بها كأنهم تقالوها
فقالوا أين نحن من النبي
صلى الله عليه وسلم قد
غفر الله له ما تقدم
من ذنبه وما تأخر
(مشکوٰۃ ص۲ ج ۱)

ازواج مطہرات کی خدمت میں حاضر
ہوئے جو حضورؐ کی عبادت کے متعلق
دریافت کرنا چاہتے تھے جب انہیں
اس کے متعلق بتایا گیا تو انھوں نے
اپنے خیال کے مطابق اسے کم سمجھا اور کہنے لگے کہ
ہم لوگوں کو حضورؐ سے کیا نسبت ہے
اللہ نے انہیں اگلے پچھلے گناہوں کی
معافی کا پروانہ عطا فرمایا ہے لہٰذا
ہمارا ان سے کیا جوڑ ہے

حدیث کے آخری ٹکڑوں میں دو بات کی اچھی طرح وضاحت ملتی
ہے پہلی بات تو یہ کہ اس جملے سے یہ چیز مترشح ہو جاتی ہے کہ صحابہ کرام بالاجماع
حضورؐ کی عصمت کا عقیدہ رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے یہ فرمایا کہ
ہمارا ان سے کیا جوڑ ہے یعنی "چہ نسبت خاک را با عالم پاک" چنانچہ صحابہؓ
کرام کے اس جملہ کی تشریح کرتے ہوئے ملا علی قاری تحریر فرماتے ہیں۔

فقالوا أين نحن من النبي
صلى الله عليه وسلم أي بيننا وبينه
بون بعيد ناقلا على صدد

صحابہ کرام نے کہا ہمارا حضورؐ سے
کیا جوڑ ہے یعنی ہمارے اور ان کے
درمیان بہت بڑا فرق ہے کیونکہ

التقریبا وسوء العاقبة	کیونکہ ہم سب کو انجام بد اور تقصیر کا
وھو معصوم مامون الخاتمة	خطرہ ہے اور آپ معصوم اور
وصدقات صحیح (۱۳)	مامون الخاتمہ ہیں ۔

آگے چل کر مزید اسی سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں ۔

وقال بعض المحققین والجامع	بعض محققین کا کہنا ہے کہ تمام صحابہؓ
الصحابة علی الاتباع به صلی الله	کرام کا بلا کسی لیس و پیش کے ہر حالت
علیه وسلم فی اقواله و افعاله	اور آنحضرتؐ کے تمام احوال اعمال
وسائر احواله حتی فی کل علمه	و اقوال اور جملہ معاملات میں آپؐ
من غیر بحث ولا تفکر بل بمجرد	کی پیروی کرنے پر اجماع کرلینا
علمهم او ظنهم بصدور ذلك	بلا ان اقوال و اعمال کے صادر ہونے
منه دلیل قاطع علی اجماعهم	کا یقین یا گمان غالب حاصل ہوجانے
علی عصمته و تفرعه علی ان	کی وجہ سے واجب الاتباع
یجری علی ظاهره	ہونے پر صحابہؓ کا اجماع کرلینا
او باطنه شئ لا یثبته	اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ وہ سب
بنبیه مسالم یقم	آنحضرتؐ کی عصمت کے قائل تھے
دلیل علی اختصاصه	اور آپؐ کی ذات کے لئے مختص
به ۔	ہونے کی دلیل نہ پانے کی صورت میں

(مرقات صفحہ ۱۸۱ ج ۱) کوئی ایسی چیز لائق پیروی نہ ہو اس سے

. . . . . . آپؐ کے ظاہر و باطن کو پاک مانتے تھے

اس حدیث کی تشریح کو پڑھ لینے کے بعد ناظرین کے لئے اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کوئی تردد نہ ہونا چاہیے کہ صحابہ کرامؓ بلا کسی اختلاف کے عصمت انبیاء کرامؑ کا عقیدہ رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی امر کے متعلق جب انھیں یہ یقین ہو جاتا تھا یا اس بات کا گمان غالب ہی ہو جاتا کہ یہ چیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے تو کسی تامل اور کسی غور و فکر کے بغیر اپنے لئے نمونہ تصور کرتے تھے کیونکہ جملہ اعمال و افعال میں آنحضرتؐ کی زندگی کو اللہ تعالیٰ نے واجب الاتباع قرار دیا ہے چنانچہ فرمایا گیا۔

لکم فی رسول اللہ رسولؐ خدا کے اندر تمہارے لئے

اسوۃ حسنۃ کامیاب نمونہ موجود ہے۔

صحابہ کرامؓ اس آیت کے حقیقی مفہوم کو اچھی طرح سمجھتے تھے اس لئے وہ آنحضرتؐ کی عصمت ماننے پر مجبور تھے کیونکہ اگر آپؐ کو معصوم نہ مانا جائے اور گناہ کا وقوع آپؐ سے بھی جائز مان لیا جائے تو پھر لازم آئیگا کہ یا تو آپؐ کی اس گناہ میں بھی پیروی کی جائے اور یا پھر آپؐ کی ساری زندگی کو ہر موقعہ پر نمونہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جائے۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں بداہۃً غلط ہیں۔

حدیث مذکور کے آخری جملے سے دوسری بات یہ بھی بالکل صاف طریقے سے معلوم ہوتی ہے کہ صحابۂ کرام قرآن شریف کی اس آیت کو عصمت کے خلاف نہ سمجھتے تھے یعنی اللہ کا یہ ارشاد۔ لیغفر اللہ لک ما تقدم من ذنبک وما تاخر لہ

صحابۂ کرام کے نزدیک عقیدۂ عصمت کے خلاف ہرگز نہ تھا بلکہ ان کے خیال میں اسی آیت سے عقیدۂ عصمت کا ثبوت نکلتا ہے یہی وجہ ہے کہ حدیث مذکور کے آخری جملہ میں انھوں نے آنحضرتؐ کی بے گناہی پر بلکہ اسی آیت سے استدلال کیا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آیت مذکور کے اندر اگلے گناہوں کے بخشنے کا ذکر ہے جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ گناہوں کا وقوع ان سے ہو چکا ہے۔ اس لئے کہ اگر گناہ واقع ہی نہ ہوتا تو مغفرت کس چیز کی کی جاتی۔ یہ استدلال بالکل غلط ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کا جو معنیٰ و مفہوم صحابۂ کرام سے منقول ہے اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توثیق حاصل ہے لہٰذا خداوند تعالیٰ کی مراد بھی وہی ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعۂ وحی اگر کسی بڑے سے غلط فہمی ہوئی ہوتی تو اس کا ازالہ کر دیا جاتا۔ باقی رہی یہ بات کہ گناہ

لہ اس آیت سے عصمت کے خلاف جو ابن مصری نے استدلال کیا ہے جواب تفصیل مذکور سے ظاہر ہے۔

کا وقوع اگر ہوتا ہی نہیں تو مغفرت کس چیز کی ہوئی اور لفظ گناہ کا اطلاق
کس حقیقت پر کیا گیا تھا تو اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ اکابر مفسرین نے
آیت کے تحت مختلف جوابات تحریر فرمائے ہیں جس کے بعد تمام شبہات
کالعدم ہو کر رہ جاتے ہیں میں اس جگہ ان میں سے صرف دو جواب نقل کرنا
کافی سمجھتا ہوں۔ ملا علی قاریؒ نے حدیث کے آخری ٹکڑے کی تشریح
کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے۔

ثم الذنب ما له تبعة دينية
او دنيوية مأخوذ من الذنب
ولما كان النبي صلى الله عليه
وسلم معاتبا بترك الاولى
تأكيدا للعصمة اطلق عليه
اسم الذنب او يكون
من باب حسنات الابرار
سيئات المقربين. قال
ابن حجر اى ستر بينه
وبينه بعصمة منه فلم
يمكن صدوره منه

گناہ اس کو کہتے ہیں کہ جس پر آخرت
یا دنیا میں کوئی مواخذہ مرتب ہو یہ
لفظ ذنب سے ماخوذ ہے چونکہ آنحضرت
صلی اللہ سے خلاف اولیٰ عمل کے
صادر ہونے پر عصمت میں قوت
پیدا کرنے کے لئے مواخذہ ہوتا
تھا اس لئے اس پر گناہ کا لفظ اطلاق
کیا گیا یا اس لئے کہ اچھے لوگوں کی
نیکیاں بھی مقربین کے لئے قصور
کا درجہ رکھتی ہیں مشہور ہے کہ
مقرباں را بیش بود حیرانی

ولو صغيرة قبل النبوة على الاصح هذا معنى المغفرة في حق الانبياء ومعناها في غيرهم ستر بينهم وبين عقوبة ذنوبهم۔

(مرقات)
ص ۱۸ ج ۱

ابن حجر کہتے ہیں کہ گناہ معاف کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ گناہ واقع ہونے کے بعد معاف کیا گیا بلکہ مطلب یہ ہے کہ گناہ اور پیغمبر کے درمیان خدا نے ایک پردہ حائل کر دیا۔ اس لئے ان سے کسی گناہ کا واقع ہونا قول صحیح کے مطابق ممکن ہی نہیں ہے اگرچہ قبل نبوت ہو اور صغیرہ ہی کیوں نہ ہو انبیاء کے حق میں مغفرت کا یہی معنی ہوتا ہے ان کے علاوہ دوسروں کے حق میں مغفرت کا معنی یہ ہے کہ ان کے درمیان اور ان کے گناہوں کی سزا کے درمیان ایک پردہ حائل کر دیا گیا

. . . .
. . . .
. . . .

ملا علی قاری کے اس بیان سے یہ بات اصولی طور پر سمجھ میں آ گئی ہو گی کہ انبیاء کرام علیہم السلام کیلئے جہاں جہاں بھی مغفرت کرنے کا تذکرہ ملتا ہے وہاں اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ ان کی ذوات مقدسہ اور گناہوں کے درمیان رکاوٹ قائم کر دی گئی ہے تاکہ کسی گناہ کا

صدور نہ ہو سکے یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ان سے گناہوں کا صدور ہو چکا ہے جو ان کی سزا انہیں معاف کردی گئی ہیں نیز ملا علی قاری کے اس بیان سے یہ چیز بھی معلوم ہو گئی کہ قرآن و حدیث میں انبیاء کرام کے کسی عمل کو اگر گناہ سے تعبیر کیا گیا ہے تو وہ گناہ کے حقیقی معنیٰ میں نہیں ہے جس پر دنیا و آخرت میں کسی سزا کا مرتب ہونا لازم آئے بلکہ کسی خلاف اولیٰ اور ایسے امر پر لفظ گناہ کا اطلاق کیا گیا ہے جو ان کے حق میں شایان شان نہ تھا یعنی وہ امر جس کو گناہ کہا گیا ہے درحقیقت اجتہاد اور رائے کی غلطی ہے جس پر نہ تو کسی سزا کا ترتب ہوتا ہے اور نہ ہی وہ چیز حقیقتاً گناہ ہوتی ہے کہ اس کو عصمت کے منافی سمجھا جائے بلکہ گناہ کے بجائے ان کو اس فعل پر ایک اجر ملتا ہے کیونکہ انھوں نے اپنی وسعت خدا کی مرضی تلاش کرنے میں خرچ کی ہے اور امکانی کوشش سے باز نہیں آئے ہیں یہی وجہ ہے کہ اس قسم کی کسی لغزش کے سبب نہ تو ان کے اندر فسق کا وجود ماننا صحیح ہے اور نہ اس کی وجہ سے ان کی عصمت اور عدالت و ثقاہت میں کوئی فرق پیدا ہوتا ہے چنانچہ اہلسنت والجماعت کے اکابر نے مندرجہ ذیل اصول میں اسی بات کی وضاحت کی ہے۔ علامہ آلوسیؒ تحریر فرماتے ہیں۔

فلان العدالة لا تنافی	پس عصمت و عدالت کے منافی
الخطأ فی الاجتهاد اذ لا	اجتہاد کی غلطی نہیں ہو سکتی کیونکہ اجتہاد

فمن نسبه کیف در المجتهد	غلطی کسی گناہ کا نام نہیں ہے اور
المخطی مأجور۔	اسے گناہ کیونکر کہا جاسکتا ہے
(۔ درج المعانی صفحہ ۳)	جب کہ اس غلطی کا مرتکب ہونے والا
	اجر و ثواب کا مستحق ٹھہرتا ہے۔

یہ تفصیل اس جواب کا حاصل ہے جو ملا علی قاری کے حوالے سے اوپر نقل کیا گیا لیکن اس شبہ سے متعلق ایک دوسرا جواب یہ بھی ہے جس کا تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے ان الفاظ میں فرمایا ہے۔

و در توجیہ غفران ذنوب آنحضرت	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گناہوں
صلی اللہ علیہ وسلم کہ قرآن مجید برآں	کی مغفرت جس پر قرآن ناطق ہے
ناطق است اقوال است بہترین	اس کی توجیہ میں بہت سے اقوال ہیں
اقوال آنست کہ ایں کلمہ تشریف است	ان سب میں بہتر قول یہ ہے کہ مغفرت
مر آنحضرت را از جانب مولی تعالیٰ	و فزائی کا جملہ ہے جو خاص آنحضرت
بہ آنکہ ذنب وجود داشتہ باشد	صلی اللہ علیہ وسلم کو خداوند تعالیٰ کی
چناں کہ صاحب مرتبۂ خود را	طرف سے بطور شرف عطا کیا گیا ہے
بگوید کہ گناہان ترابخشیدم۔ تو	اس کے بغیر کہ آپ کے لئے کسی گناہ
فارغ البال باش و ہیچ اندیشہ	کا وجود مانا جائے جیسے کہ آقا اپنے
مکن اگرچہ آں بندہ گناہ	غلام سے کہتا ہے تم فکر نہ کرو اور بالکل

نہ داشتہ باشد۔

(اشعۃ اللمعات صفحہ ۱۳۲ ج ۴)

مطمئن رہو تمہارے گناہ ہم نے معاف کر دیئے اگرچہ اس وقت تک ان لوگوں سے کوئی گناہ بھی وقوع میں نہیں آیا ہو۔

یعنی جس طرح بڑے لوگ اپنے چھوٹوں کی عزت افزائی اور طیب خاطر کے لئے اپنے تعلق و محبت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں جاؤ تمہارے سب قصور معاف کر دیئے حالانکہ اس بیچارے سے کوئی قصور بھی نہیں ہوا ہوتا لیکن پھر بھی یہ جملہ محاورے میں درست سمجھا جاتا ہے اور جس کے حق میں استعمال کیا گیا ہے وہ اس جملے کو اپنے لئے باعث شرف تصور کرتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے جملوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ شرف عطا فرمایا ہے اور آپ سے اپنے غایت تعلق و محبت کا اظہار فرمایا ہے۔

احمد امین مصری کا استدلال غلط ہے

گذر چکا ہے کہ احمد امین

مصری صاحب نے عصمت انبیاء کے عقیدے کو دور صحابہ کے بعد کی ایجاد قرار دیا ہے اور اس عقیدے کو صریح قرآن کے خلاف بتایا ہے لیکن جہاں تک اپنے اس دعوے کے حق میں ثبوت فراہم کرنے کا تعلق ہے تو احمد امین صاحب نے اس پر نہ کسی قابل اعتماد شخص کی کوئی تائید نقل کی ہے اور نہ ہی اسلامی کتابوں

کے ذخیرے میں تلاش وجستجو کے باوجود بھی کوئی ایسی چیز دستیاب ہو سکی ہے جسکو وہ اپنے دعویٰ کے لئے بطور دلیل پیش کر سکتے۔ بڑی کد وکاوش کے بعد امام غزالیؒ کی ایک عبارت کو مفید مطلب سمجھتے ہوئے انھوں نے بے جگہ استعمال کر کے اس سے اپنا عقیدہ کشید کرنا چاہا ہے۔ چنانچہ بڑے فخر کے ساتھ لکھتے ہیں۔

ويعجبني في ذالك قول الغزالي في التوبة وليس في الوجود آدمي إلا وشهوته سابقة وغريزته اللتي هي عدة الشيطان متقدمة على غريزته اللتي هي عدة الملئكة فكان الرجوع اليه عما ساعدته الشهوات ضروريًا في حق كل انسان نبيًا كان او غبيًا فلا تظنن ان هذه الضرورة

امام غزالیؒ کا قول جو توبہ کے متعلق انھوں نے لکھا ہے وہ مجھے بہت پسند آیا وہ یہ کہ وجود میں کوئی آدمی نہیں مگر یہ کہ شہوت اس کے اندر عقل کی آمد سے پہلے ہی پائی گئی ہے اور وہ فطری مادے جو شیطانی وسائل ہیں انسان کی ان قوتوں پر جو فرشتگانہ ہیں مقدم ہوتے ہیں لہٰذا جو شہوانی تقاضے کی موافقت کا جذبہ انسان میں پہلے سے موجود ہے اس سے رجوع کرنا ہر شخص کے لئے ضروری ہوگا چاہے نبی ہو یا

اختصت بآدم علیہ السلام۔ . . . .

یعنی بنا بریں تمہیں یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ توبہ اور رجوع کی ضرورت صرف آدم کے لئے خاص ہے۔

ولھذا قال علیہ السلام انہ لیغان علی قلبی حتی استغفر اللہ فی الیوم و اللیلۃ سبعین مرۃ۔ (فجر الاسلام صفحہ ۲۳)

اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ پردہ (شبہ میرے قلب پر ابر غفلت) چھا جاتا ہے حتیٰ کہ میں دن رات میں ستر مرتبہ خدا سے استغفار کرتا ہوں۔

کتاب کے حاشیہ میں احمد امین صاحب "اختصت بآدم علیہ السلام" کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

یشیر الی قولہ تعالیٰ وعصیٰ آدم ربہ فغویٰ ثم اجتباہ ربہ فتاب علیہ وھدیٰ (حاشیہ فجر الاسلام صفحہ ۲۳ ج ۳)

یعنی امام غزالیؒ کا اشارہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرف ہے آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور بھٹک گئے پھر خدا نے ان کا انتخاب کیا اور ان کی توبہ قبول کی اور رہنمائی فرمائی۔

اس جگہ بھی احمد امین مصری صاحب اپنی کجروی اور غلط فہمی

کی وجہ سے یا تو خود فریب کا شکار ہو ئے ہیں یا پھر انھوں نے قصداً دوسروں کو فریب دینا چاہا ہے اس لئے کہ آیت مذکورہ بالا کی طرف امام غزالیؒ کا اشارہ ہرگز نہیں ہے جیسا کہ احمدی صاحب ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں بلکہ امام غزالیؒ کا اشارہ درج ذیل مشہور آیت کی طرف ہے جس میں آدم علیہ السلام کے اعتراف اور توبہ ورجوع کی صراحت بھی پائی جاتی ہے اس کے برخلاف یہ باتیں گذشتہ آیت میں موجود نہیں ہیں بلکہ اس آیت میں تو صرف واقعہ کا بیان اور حکایت کی نقل کا تذکرہ ہے وہ آیت مشہور یہ ہے۔

ربنا ظلمنا انفسنا وان	اے ہمارے رب ہم نے اپنے
لم تغفر لنا وترحمنا	اوپر ظلم کر لیا ہے اگر تو معاف نہ
لنکونن من	کریگا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو
الخاسرین ٥	ہم خاسرین میں شمار ہونگے۔

لیکن اس آیت میں چونکہ حضرت آدم علیہ السلام کے توبہ کرنے اور مغفرت کی درخواست کرنے کا ذکر ہے احمدی صاحب کو حضرت آدم کی طرف عصیان وغوایت کی نسبت اس کے اندر نہیں مل سکتی تھی جس سے وہ اپنا عقیدہ ثابت کر سکتے اس لئے انھوں نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ امام غزالیؒ کا اشارہ اس آیت کی طرف موڑ دیا جو بظاہر

ان کے خیال میں آدم علیہ السلام کی طرف غوایت وعصیان کے نسبت کی وجہ سے عصمت انبیاؑ کے خلاف معلوم ہو رہی تھی باپ بہم ہوں امام غزالیؒ کی اس عبارت کا مقصود بھی وہ نہیں ہے جو احمد امین مصریؒ ناظرین کے ذہن میں اتارنا چاہتے ہیں جیسا کہ امام غزالیؒ کی اس عبارت کے متعلق آئندہ صفحات میں تفصیلی نقد وتبصرہ سے واضح ہوجائیگا ان باتوں کے علاوہ ایک بنیادی بات سوچنے کی یہ بھی ہے کہ امام غزالیؒ کا یہ بیان کہ خواہشات نفس کے تقاضے اور شیطانی قوتوں کا تسلط ہر انسان کے اندر خیر وصلاح کی آمد سے پہلے ہی پایا جاتا ہے۔ بالخصوص انبیاء کرام کے سلسلہ میں ان کی یہ تحقیق اور اس پر حدیث "انہ لا یغان علی قلبی" سے استدلال کرنا کسی طرح سے درست نہیں ہے جیسا کہ اس مسئلہ کی تحقیق ناظرین کے سامنے آئندہ پیش کی جانیوالی ہے اس وقت امام غزالیؒ کے اس نظریئے کی کمزوری واضح کردیجائیگی مختصراً اس حدیث کے متعلق اتنی بات یہاں بھی سمجھ لینی چاہیئے کہ نہ تو اس حدیث میں خیر وصلاح کی آمد سے پہلے قوت مستترہ کے موجود ہونے کا کوئی تذکرہ ہے اور نہ ہی عقیدہ وعمل کی کسی خرابی کا ذکر ہے اس لئے اس حدیث کے ذریعہ تو امام غزالیؒ کا نظریہ ثابت ہوتا

ہے اور نہ احمد امین مصری صاحب کا عصمت انبیاء کے خلاف استدلال کرنا ہی درست ہوتا ہے کیونکہ حدیث کا صاف اور واضح مطلب صرف یہ ہے کہ انسانی قلب کی کیفیت ہمیشہ یکساں نہیں رہتی بلکہ مختلف حالات اور اوقات میں قبض و بسط غفلت و بیداری اور انشراح و انقباض کی مختلف کیفیات اس پر طاری ہوتی رہتی ہیں اس طرح قلب پر مختلف کیفیتوں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہتا ہے پس بسط و انشراح کی کیفیتوں کا زائل ہو جانا اور اس کی جگہ قبض و غفلت کی کیفیتوں کا آ جانا گویا پہلی کیفیت کے درمیان دوسری کیفیت یعنی غفلت تجگہ حائل ہو جاتی ہے یہ چیز تمام انسانوں میں ایک فطری امر ہے جس سے کوئی فرد بشر بچ نہیں سکتا۔ بنابریں پہلی کیفیت کے حصول و اعادہ کے لئے اور دوسری کیفیت سے پیدا شدہ ابر غفلت کو زائل کرنے کی غرض سے توبہ استغفار کرنا ایک دوسری چیز ہے اور اس سے قوت شر کے مقدم ہونے یا کسی نبی کے غیر معصوم ہونے پر استدلال کرنا بالکل دوسری بات ہے۔ دونوں باتوں کے اندر بہت واضح اور عظیم فرق ہے جسکو محسوس نہ کرنا سراسر نادانی اور کج فہمی ہے۔ بہر حال احمد امین مصری صاحب نے انبیاء کرام کی عصمت کے سلسلہ میں جو خیال ظاہر کیا تھا اسی سے متاثر ہو کر ہندو پاک کے مشہور مصنف ابوالاعلیٰ مودودی

صاحب نے بھی عصمت انبیاؑ کے متعلق اسی انداز سے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔

جو لوگ مودودی صاحب کے

عصمت انبیاؑ اور سید ابوالاعلیٰ مودودی

انداز فکر اور طریق مطالعہ سے واقف ہیں انھیں اس بات کے باور کرنے میں کوئی تامل نہ ہوگا کہ احمد امین مصری صاحب سے ہی انھوں نے اس مسئلہ میں اثر قبول کیا ہے اور بلاشبہ مودودی صاحب نے عصمت انبیاؑ کے مسئلہ میں احمد امین مصری صاحب ہی کے انداز فکر سے کام لیا ہے بلکہ کوئی عجب نہیں کہ مودودی صاحب نے احمد امین مصری کی کتاب مذکور سے براہ راست اس نظریہ میں استفادہ کیا ہو بہر صورت معاملہ جو بھی ہو مودودی صاحب بھی عصمت انبیاؑ کے مسئلہ میں اسی راہ پر چلے ہیں جس کی رہنمائی ان سے قبل احمد امین مصری صاحب کر چکے ہیں چنانچہ مودودی صاحب فرماتے ہیں۔

۱۔ عصمت دراصل انبیاء علیہم السلام کے لوازم ذات سے نہیں، ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو منصب نبوت و رسالت کی ذمہ داریاں صحیح طور پر ادا کرنے کے لئے مصلحتاً خطاؤں اور لغزشوں سے محفوظ فرمایا ہے۔

۲۔ ورنہ اگر اللہ تعالیٰ کی حفاظت تھوڑی دیر کے لئے بھی ان سے منفک ہو جائے تو جس طرح عام انسانوں سے بھول چوک اور غلط فہمی ہو جاتی ہے اسی طرح انبیاء علیہم السلام سے بھی ہو سکتی ہے۔

۳۔ اور یہ ایک لطیف نکتہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بالارادہ ہر نبی سے کسی نہ کسی وقت اپنی حفاظت اٹھا کر ایک دو لغزشیں سرزد ہونے دی ہے۔

۴۔ تاکہ لوگ انبیاء علیہم السلام کو خدا نہ سمجھیں اور جان لیں کہ یہ بشر ہیں خدا نہیں ہیں (تفہیمات صفحہ ۴۳)

چونکہ مذکورہ عبارت انبیاء علیہم السلام کی عصمت کے مسئلہ میں مودودی صاحب کے بنیادی نظریئے کی وضاحت کرتی ہے اس لئے بڑی احتیاط اور دیانت داری کے ساتھ یہ عبارت حرف بحرف ان کی کتاب تفہیمات جلد دوم صفحہ ۴۳ سے نقل کی گئی ہے۔

عبارت کے تمام جملوں پر نمبرات قائم کرنے کی غرض سے اس کو چار حصوں میں تقسیم کر لیا گیا ہے تاکہ ہر جملے پر الگ تبصرہ کیا جا سکے اور ناظرین کے لئے سہولتِ فہم کا ذریعہ بن جائے۔ مودودی صاحب کی اس عبارت سے عصمتِ انبیاء کے مسئلہ میں ان کا بنیادی نظریہ واضح ہو جاتا ہے اس پر جب بحث و تنقید کی جاتی ہے تو ان کے معتقدین

ہوا خواہوں اور معتقدین کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ مودودی صاحب کی یہ عبارت اپنے مفہوم میں مجمل اور ناقص ہے اور اس بات کے باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ مودودی صاحب نے اس عبارت میں جو بات کہنا چاہا ہے وہ پوری طرح صاف نہیں ہو پائی ہے اس لئے ان کی اس عبارت کا مقصود اصلی ان کی درج ذیل تشریح کو سامنے رکھ کر متعین کرنا چاہیئے۔ بنا بریں ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم کسی گفتگو کو شروع کرنے سے پہلے مودودی صاحب کی تشریحی عبارت کو بھی نقل کر دیں۔ وہ تشریحی عبارت سوال وجواب کی شکل میں جس طرح ان کی اصل کتاب میں ہے بلفظہٖ نقل کی جاتی ہے۔

سوال :۔ یہ امر مسلّم ہے کہ نبی معصوم ہوتے ہیں مگر آدم علیہ السلام کے متعلق قرآن کے الفاظ صریحاً ثابت کر رہے ہیں کہ آپ نے گناہ کیا اور حکم عدولی کی جیسے ولا تقربا ھٰذہ الشجرۃ فتکونا من الظالمین کی آیت ظاہر کر رہی ہے۔ اس سلسلہ میں اپنی تحقیق کے نتائج سے مستفید فرمائیں۔

جواب :۔ نبی کے معصوم ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فرشتوں کی طرح اس سے کبھی خطا کا امکان سلب کر لیا گیا ہے بلکہ اس کا مطلب در اصل یہ ہے کہ نبی اولاً تو دانستہ نافرمانی نہیں کرتا اور اگر اس سے غلطی سرزد ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس غلطی پر قائم نہیں رہنے دیتا۔ پھر یہ بات

بھی لائق غور ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے جو نافرمانی سرزد ہوئی تھی وہ نبوت کے منصب پر سرفراز ہونے سے پہلے کی ہے اور قبل نبوت کسی نبی کو وہ عصمت حاصل نہیں ہوئی جو نبی ہونے کے بعد ہوا کرتی ہے۔ نبی ہونے سے پہلے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی ایک بہت بڑا گناہ ہو گیا تھا کہ انھوں نے ایک انسان کو قتل کر دیا۔ چنانچہ جب فرعون نے ان کو اس فعل پر ملامت کی تو انھوں نے بھرے دربار میں اس بات کا اقرار کیا کہ فعلتہا اذاً وانا من الضالین (الشعراء) یعنی یہ فعل مجھ سے اس وقت سرزد ہوا جب راہ ہدایت مجھ پر کھلی نہیں تھی۔ مختصراً یہ بات اصولی طور پر سمجھ لیجئے کہ نبی کی معصومیت فرشتے کی سی معصومیت نہیں ہے کہ اسے خطا اور غلطی اور گناہ کی قدرت ہی حاصل نہ ہو بلکہ وہ اس معنی میں ہے کہ نبوت کے ذمہ دارانہ منصب پر سرفراز کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ بطور خاص اس کی حفاظت و نگرانی کرتا ہے اور اسے غلطیوں سے بچاتا ہے اور اگر کوئی چھوٹی موٹی لغزش اس سے سرزد ہو جاتی ہے تو وحی کے ذریعہ سے فوراً اس کی اصلاح کر دیتا ہے تاکہ اس کی غلطی ایک پوری امت کی گمراہی کی موجب نہ بن جائے (ترجمان القرآن رجب شوال ۱۳۶۳ھ جولائی اکتوبر ۱۹۴۴ء) اور رسائل و مسائل حصہ اول صفحہ ۲۵ طبع اول اگست ۱۹۵۱ء)

مودودی صاحب کے عقائد و افکار ان عبارتوں کے ذریعہ سامنے آ گئے

کے بعد ضروری ہو جاتا ہے کہ ان کے خیال کی کمزوریوں کی نشاندہی کر دی
جا سکے اور یہ واضح کر دیا جائے کہ ان کا نظریہ اہلسنت والجماعت کے متفقہ
عقیدہ سے کس قدر مختلف ہے اور اس کے دور رس نتائج اور نقصان دہ پہلو
کیا کیا ہیں لیکن ان باتوں کا سمجھنا جب ہی ممکن ہے کہ پہلے اصل مسئلے کی تمام
تفصیلات معلوم ہو جائیں اور اس عقیدے سے متعلق اہل سنت والجماعت کا
جو موقف ہے اس کو روشنی میں لایا جائے تاکہ آسانی کے ساتھ ناظرین اس
اختلاف کی نوعیت کو سمجھ سکیں۔ بنا بریں سب سے پہلے عصمت کا معنی و مفہوم
اور اہلسنت کے نزدیک جو اس لفظ کی تعریف و حقیقت ہے اس کو تحریر کر دینا
ضروری ہے چنانچہ حوالوں کے ساتھ عصمت کی تعریف پیش خدمت ہے۔

عصمت کا مطلب کیا ہے

علامہ محب اللہ بہاری مسلم الثبوت میں اور علامہ عبد العلی بحر العلوم اس کی
شرح فواتح الرحموت میں رقمطراز ہیں۔

وهی عدم قدرة المعصية عند	یہ عصمت بعض لوگوں کے خیال میں معصیت پر
البعض و نسبه بعض الروافض	قدرت نہ ہونے کے مترادف ہے بعض رافضیوں
الى الشيخ ابی الحسن الاشعری	نے اس خیال کو شیخ ابو الحسن اشعری کی طرف منسوب
قدس سره و هی خلق مانع	کر دیا ہے حالانکہ ان کا یہ مسلک نہیں ہے (دیکھئے
عن ارتکاب المعصية غير ملجئ	شرح مواقف) یا یہ عصمت ایسی فطری خصلت

حتی لا یکون العصمۃ مضطرا فی ترک المعصیۃ ولا فی فعل الواجب وھو المختار عند الجمھور۔

(فواتح الرحموت صفحہ ۳۰)

ہے جو عصمت کے ارتکاب سے روکتی ہے مگر بے اختیار نہیں بناتی کہ معصوم گناہ سے پرہیز کرنے یا کسی واجب العمل کام کے کرنے پر مجبور اور بے بس سمجھا جائے جمہور اہلسنت اشاعرہ و ماتریدیہ کا مسلک مختار یہی ہے۔

عصمت کے مفہوم کے سلسلہ میں دو نقطہائے نظر ہیں۔ پہلا نقطۂ نگاہ شیعوں اور بعض معتزلہ کا ہے وہ یہ کہ کسی کے معصوم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کسی قسم کے گناہ کرنے کی اس میں قدرت ہی نہیں ہے گویا سلب امکان اور بے قدرتی ہی کا دوسرا نام عصمت ہے۔ اس کے برخلاف اہلسنت والجماعت کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ بے قدرتی اور سلب امکان کا نام عصمت نہیں ہے بلکہ جملہ معاصی کے ارتکاب کی صلاحیت اور اس پر مکمل قدرت و اختیار ہونے کے باوجود معصوم کبھی بھی کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کرتا ہے گویا معصومیت بے اختیاری کا نام نہیں ہے بلکہ اختیار و قدرت کے باوجود بے گناہی کا نام معصومیت ہے اور یہ پیدائشی خصلت جو گناہ سے باز رکھتی ہے اسی کو عصمت کہتے ہیں۔ حاشیہ نبراس میں ہے۔

العصمۃ ان لا یخلق اللہ فی

عصمت یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ بندے کو

العبد المذنب مع بقاء قدرته — بے گناہ رکھے اگرچہ بندہ کا اس کے

اختیاره (حاشیہ نبراس صفحہ ۳۲۲) — ارتکاب پر قدرت و اختیار باقی ہو۔

علم عقائد کی مشہور کتاب شرح فقہ اکبر میں ملا علی قاریؒ تصریح فرماتے ہیں۔

اختلف الناس في كيفية العصمة — لوگ عصمت کی کیفیت میں مختلف الخیال

فقال بعضهم هي محض فضل الله — ہیں بعض کہتے ہیں کہ محض عطیہ خداوندی

تعالى بحيث لا اختيار للعبد — ہے جس میں بندے کے اختیار کی کوئی

فيه وذالك اما بخلقهم — گنجائش نہیں ہے پھر یہ لوگ عصمت

على الطبع بخلاف غيرهم — کی تعبیر میں دو گروہ ہو گئے اور یہ اس

بحيث لا يميلون الى المعصية — طرح حاصل ہوتا ہے کہ معصومین کی

ولا ينفرون عن الطاعة — تخلیق ہی ایسے مزاج پر کی جائے جو

كطبع الملائكة واما — ان کے علاوہ دوسروں سے بالکل جدا

بصرف همتهم عن السيئات — ہو کہ معصیت کی طرف توجہ کرنا اور طاعت

وجذبهم الى الطاعات — سے بے توجہی برتنا ان کے بس ہی میں نہ

جبرا من الله تعالى بعد — رہے جیسے کہ فرشتوں کا مزاج ہے

ان ادرج في طبائعهم — اور یا پھر یہ کہا جائے کہ جو باتیں دوسری

ما في طباع البشر — انسانی طبیعتوں میں پائی جاتی ہیں وہ تو

وقال بعضهم العصمة
لطف من الله ولطفه
يمكن على وجه يبقى
اختياره بعد العصمة
في الاقدام على الطاعة
والامتناع عن المعصية
واليه مال الشيخ
ابو منصور الماتريدي
حيث قال العصمة
لا تزيل المحنة
اي الابتلاء و
الامتحان يعني لا
تجبره على فعل الخير
ويزجره عن الشر
مع بقاء الاختيار
تحقيقا للابتلاء والامتحان
(شرح فقہ اکبر ص ۴۲)

ان معصوموں میں بھی موجود ہیں مگر اس
کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کا مزاج
خیر کی طرف مائل کر کے سیئات سے
ذہنی دوری رکھا ہے کہ اب وہ بے
اختیار ہو گئے ہیں اور بعض لوگوں کا خیال
ہے کہ عصمت خداوند تعالیٰ کا فضل و عطیہ
تو ضرور ہے لیکن اس کی صورت
کہ خیر پر اقدام کرنے اور معصیت
سے بچنے کا ان کے اندر اختیار [illegible] ہے
اسی نظریہ کی طرف شیخ ابو منصور ماتریدی
کا رجحان ہے کیونکہ ان کا کہنا ہے کہ عصمت
تکلیف یعنی امتحان و آزمائش کا امکان
ختم نہیں کر دیتی ہے مطلب یہ ہے
کہ معصوم کو نیک کام کرنے پر عصمت مجبور
نہیں کرتی لیکن برائی سے روکتی
ہے اگرچہ ارتکاب کی قدرت باقی رہتی
ہے تاکہ امتحان و آزمائش کا تحقق ہو سکے

شرح فقہ اکبر کے اس طویل اقتباس کا حاصل یہ ہے کہ عصمت کی حقیقت سے متعلق بنیادی طور پر دو قسم کے خیال ہیں۔ اول یہ ہے کہ عصمت اگرچہ اعطائے الٰہی حاصل ہونیوالی ہی نعمت ہے لیکن اس کے حاصل ہوجانے کے بعد بندہ میں گناہ کرنے کی قدرت باقی نہیں رہتی۔ گویا عصمت معصوم کے مسلوب القدرت یا قدرت سے محروم ہوجانے کا نام ہے بغیر کس سلب امکان اور بے اختیاری کے جو لوگ قائل ہیں ان کے دو گروہ ہیں۔ کچھ لوگ تو اس بات کے قائل ہیں کہ معصوم کی ذات فطری طور پر ان صلاحیتو سے محروم ہی کردی جاتی ہے جس سے گناہ کا امکان پیدا ہو یعنی ان میں عام انسانی طبیعتوں کی طرح گناہ کرنے کا مادہ ہی نہیں رکھا جاتا بلکہ وہ فرشتوں کی طرح گناہ کے ارتکاب کی قدرت ہی سے محروم ہیں لہٰذا ان میں اس کے ارتکاب کی نہ قدرت باقی رہتی ہے اور نہ اختیار حاصل ہوتا ہے اور کچھ لوگ ان میں کے اس بات کے قائل ہیں کہ معصوم گناہ کی فطری صلاحیتوں سے محروم تو نہیں کیا جاتا۔ اس کے اندر بھی انسانی طبیعتوں کے تقاضے موجود ہوتے ہیں مگر اس کے باوجود نیکیوں پر اس کو زبردستی لگادیا جاتا ہے اور گناہوں سے بالجبر روک دیا گیا ہے۔ خود اپنے ارادہ اور اختیار سے وہ نہ تو نیکیوں پر قائم ہے اور نہ ہی گناہوں سے پرہیز کرتا ہے بلکہ وہ بے بس اور مجبور ہے کہ نیکی کرے اور گناہ سے دور رہے اس کے برخلاف شیخ ابو منصور ماتریدی و دیگر

اہلسنت والجماعت کا نقطۂ نظر عصمت کے سلسلے میں یہ ہے کہ عصمت ایک ایسی
کمال اور محض عطیۂ ربانی تو ضرور ہے جو معصوم کو گناہوں سے باز رکھتا ہے
مگر وہ نیکیوں پر اقدام کرنے یا گناہ سے پرہیز کرنے میں بے اختیار و مجبور
نہیں ہے بلکہ وہ اپنے ہی اختیار اور قدرت سے بالارادہ نیکی کرتا ہے اور
اسی طرح بالارادہ اپنے اختیار سے گناہوں سے گریز کرتا ہے۔ اس عصمت کی
وجہ سے وہ نہ مجبور ہے نہ بے اختیار۔ ایسے ہی وہ عصمت کے حاصل ہونے کی
وجہ سے عام انسانی طبیعتوں کے جذبات اور فطری تقاضوں یا گناہوں کی صلاحیتوں
سے محروم نہیں ہے بلکہ یہ سب کچھ اس کے اندر موجود ہیں لیکن اس کے باوجود وہ
بہ اختیار خود گناہوں سے پرہیز کرتا ہے اور نیکیوں کی طرف ہر وقت متوجہ
رہتا ہے۔ اہلسنت کی دلیل یہ ہے کہ معصوم احکام شرعیہ کا پابند اور مکلف
ہوتا ہے اس میں تو کسی کو اختلاف نہیں لہٰذا جب معصوم پر شرعی تکلیف کا
نفاذ ہے تو اس کے بے اختیار اور مجبور ہونے کا کوئی معنیٰ ہی نہیں ہو سکتا
احکام شرعیہ یا تکلیف شرعی کا مطلب یہی ہے کہ مکلف اپنے اختیار اور اپنی
قدرت سے ہی عمل کریگا۔ اگر کوئی نیک عمل کرتا ہے تو اپنے ارادہ سے کرے
اور اگر وہ کسی برے کام سے پرہیز کرتا ہے تو اپنے ارادہ اور قدرت سے
پرہیز کرے ورنہ بے بس اور بے اختیار آدمی سے کسی ایسے کام کا مطالبہ
کرنا جو اس کے بس سے باہر ہو اسی طرح بے سود ہوگا جیسے کسی اندھے

سے دیکھنے کا مطلب اور ایسے ہی جو چیزاس کے اختیار سے پہلے ہی باہر ہے
اس سے روکنا بھی بے معنیٰ ہوگا کیونکہ وہ بے اختیاری کی وجہ سے پہلے ہی اس
عمل سے رکا ہوا تھا مثلاً اندھے کو یہ کہنا بے معنیٰ ہوگا کہ تم مت دیکھو۔ ظاہر ہے
کہ وہ دیکھنے کے عمل سے تو اس حکم سے پہلے ہی سے رکا ہوا ہے پھر یہ حکم تحصیل حاصل
کے سوا کیا ہوگا۔ بنابریں معصوم کا مکلف ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں
اختیار و قدرت ہر گناہ کی ہوتی ہے۔ عصمت کا فائدہ صرف یہ ہے کہ وہ قدرت
و اختیار کے باوجود گناہ سے بالارادہ پرہیز کرتا ہے اور بالارادہ نیکیوں کی
طرف متوجہ ہوتا ہے ورنہ عصمت کا مطلب اگر سلب قدرت یا بے اختیاری
اور مجبوری لے لیا جائیگا تو پھر تکلیف شرعی کا کوئی معنیٰ ہی نہ ہوگا۔ لہٰذا معصوم
کو مکلف ماننا اس کے با اختیار اور صاحب قدرت ہونے کی سب سے بڑی دلیل
ہے۔ ملا علی قاری علیہ الرحمتہ نے گذشتہ عبارت میں اس کی تصریح فرمائی ہے
اور مزید اس کی تشریح دوسری جگہ ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔

لانه لو كان الذنب ممتنعا	اس لئے کہ اگر گناہ معصوم کی قدرت سے
لما صح تكليفه بتركه	باہر ہوتی تو اس کو گناہ سے باز رہنے کا
كما ان الاعمى لا ينهى عن النظر	مکلف بنانا درست ہی نہ ہوگا جیسے کہ
والمرتعش لا يطلب منه السكون لانه حصل	اندھے آدمی کو دیکھنے سے اور رعشہ زدہ
فكذا تكليفه بما هو حاصل	انسان کو سکون سے نہیں روکا جا سکتا کیونکہ

طاقت ـ (وہ ضرورت ان کے اختیار سے ہی باہر ہیں)

(شرح فقہ اکبر صفحہ ۱۸۰) یعنی تحصیل حاصل ہے اور مکلف بنانا ایسی چیز کا
- - - - - - - درست نہیں ہے جس میں کلفت کا تصور بھی ممکن نہ ہو

خلاصہ یہ ہے کہ جن لوگوں کے حق میں عصمت کا عقیدہ قائم کیا گیا ہے
ان کے متعلق یہ عقیدہ پہلے ہی سے اپنی جگہ متفق علیہ ہے کہ احکام شرعیہ کی
پابندی ان کے لیے بھی ضروری ہے۔ خدا کی طرف سے جتنے اوامر و نواہی
عام انسانوں کے لئے نافذ کیے گئے ہیں ان سب سے وہ کلی طور پر مستثنیٰ نہیں
ہیں بلکہ تکلیف شرعی یا بلفظ دیگر احکام الٰہی منجانب اللہ ان پر بھی لاگو
ہیں اور یہ بات مسلم ہے کہ شریعت کے امر و نہی کا تعلق انھیں چیزوں سے
ہوتا ہے جو بندے کے اختیار و قدرت سے باہر ہوں۔ ورنہ جو امور کہ
انسان کی قدرت سے ہی باہر ہوں ان پر بندش لگانا یا ان کا مطالبہ
کرنا بالکل مہمل اور بے معنی قسم کی بات ہے مثلاً ایک شخص اندھا ہے دیکھنا
اس کے اختیار کی بات نہیں اسی طرح نہ دیکھنے پر بھی وہ فطرتاً مجبور ہے
اب اگر اس اندھے پر یہ بندش لگائی جائے کہ تم مت دیکھو تو یہ حکم ہی بے
معنی ہوگا اور بالکل لاحاصل بندش ہوگی۔ کیونکہ نہ دیکھنا تو اس کی
فطری اور بے اختیاری چیز تھی جو اس بندش لگانے سے پہلے بھی اس
کو حاصل تھی ایسا نہیں ہے کہ تعمیل حکم کے خیال سے اس اندھے نے اپنے

ارادہ سے اس کو پسند کیا ہو اور نافرمانی کے خطرے سے ور دیکھنے سے باز رکھا ہو اس لئے جس شخص کو معصوم مانا گیا ہے اس کے حق میں عصمت کا مطلب اس کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ شخص جملہ گناہوں کے ارتکاب پر اختیار و قدرت رکھنے کے باوجود گناہ سے بالارادہ پرہیز کرتا ہے اگرچہ اس کی ذات میں تمام صلاحیتیں موجود ہیں وہ مجبور نہیں ہے مگر قدرت نے اس کی ذات میں ایک ایسی چیز کو ودیعت کر دی ہے جو گناہوں سے اس کو باز رکھتی ہے اسی مضمون کو امام غزالیؒ نے تفصیل کے ساتھ اس انداز میں بیان فرمایا ہے۔

امام غزالیؒ کی اصل عبارت اور احمد امین مصری کی غلط فہمی کا ازالہ

امام غزالی علیہ الرحمۃ احیاء العلوم جلد چہارم میں اس بات پر بحث کرتے ہوئے کہ توبہ ہر شخص کے لئے ضروری ہے اور ہر حالت میں واجب ہے فرماتے ہیں

وتوبوا الی اللہ جمیعا ایھا المومنون لعلکم تفلحون

اے ایمان والو سب خدا کی طرف توبہ کے ساتھ متوجہ ہو جاؤ ممکن ہے کہ کامیابی حاصل کر لو۔

پس خدا نے اس جگہ خطاب عام فرمایا ہے اور نور بصیرت بھی اسی بات کی رہنمائی کرتا ہے کیونکہ توبہ کہتے ہیں اس راستے سے ہٹ جانے کو

جو خدا سے دور اور شیطان سے قریب کرتا ہے مگر یہ کام عقلمند سے ہی ہو سکتا ہے اور جو ہر عقل کی تکمیل اسی صورت میں ہو گی کہ جب غضب و شہوت اور دوسرے رذائل جو انسان کے بہکانے ہیں شیطان کے لئے وسائل کا کام دیتے ہیں وہ سب کے سب مکمل طریقے پر موجود ہوں یہی وجہ ہے کہ کمال عقل چالیس سال کی عمر کے قریب حاصل ہوتا ہے البتہ اس کی بنیاد قریب بلوغ ہی پڑ جاتی ہے اور اس کے مبادیات ۷ سال کے بعد ہی ظاہر ہونے لگتے ہیں اور خواہشات نفس گویا کہ شیطانی فوج کا نام ہے اور عقول گویا کہ فرشتگان قوتوں کا نام ہے پس جب یہ دونوں جمع ہوں گے یقیناً دونوں کے مابین جنگ چھڑ جائے گی اس لئے کہ ایک قوت دوسرے کو قدم جمانے کا موقع دینا ہرگز پسند نہ کرے گی کیونکہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں لہٰذا ان دونوں کے درمیان ایسا ہی اختلاف ہوگا جیسے رات اور دن یا نور و ظلمت کے درمیان اختلاف ہے اور جس وقت ان میں سے ایک کا غلبہ ہو جائے گا وہ لامحالہ دوسرے کو اکھاڑ پھینکے گا اور چونکہ خواہشات مکمل طور پر عقل کی تکمیل سے پہلے ہی بچپن اور جوانی ہی میں وجود پذیر ہو جاتی ہے اس لئے شیطانی فوج کا قبضہ اور تسلط قلب پر ہو جاتا ہے اور قلب کو بھی ان سے الفت ہو جاتی ہے لہٰذا شہوانی تقاضوں کا عادت بن جانا یقینی امر ہے اس لئے وہ قلب پر غالب رہتے ہیں اور ان سے دل کا علیحدگی اختیار کرنا بڑا دشوار ہوتا

پھر جب اس کے بعد آہستہ آہستہ عقل کا ظہور ہونے لگتا ہے جو کہ خدائی طاقت اور اس کی معاون ہے۔ نیز اس کے محبوبوں کو شیطانی دشمنوں کے ہاتھوں سے نجات دلانے والی ہے لہٰذا یہ عقل اگر قوی نہ ہو پائی اور اس میں کمال پیدا نہ ہو سکا تو دل پر شیطان کا اقتدار باقی رہ جاتا ہے اور وہ ملعون اپنا وعدہ پورا کر لیتا ہے جو اس نے کہا ہے کہ

لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلًا ۔ تھوڑے لوگوں کے سوا تمام ذریت آدم کو برباد کر کے رہوں گا۔

اور اگر عقل کامل اور مضبوط ہوتی ہے تو اس کا سب سے پہلا کام شہوات کو توڑ کر غلط عادتوں کو زائل کر کے اور بالجبر عبادات کی طرف موڑ کر شیطانی قوتوں کا خاتمہ کر ڈالنا ہے اور توبہ اسی کا نام ہے کیونکہ توبہ کہتے ہیں ایسے راستے سے لوٹ کر خدا کی طرف متوجہ ہونے کو جس کی شہوت رہنما ہے اور شیطان معاون ہے پس کوئی آدمی وجود پذیر نہیں ہوا ہے مگر یہ کہ شہوت اس کے اندر عقل کی آمد سے پہلے ہی موجود ہوئی اور وہ پیدائشی خصائل جو شیطانی وسائل ہیں اس شخص کی فطری فرشتگانہ قوتوں سے مقدم ہوئی ہیں لہٰذا جو شہوانی تقاضوں کی موافقت کا مادہ آدمی میں پہلے سے موجود ہے اس سے رجوع یعنی (توبہ) کرنا ہر انسان کے لیے ضروری ہے چاہے وہ نبی ہو یا غبی۔ بنا بریں تمہیں یہ سمجھنا چاہیے کہ توبہ و رجوع کی ضرورت صرف حضرت آدم علیہ السلام کے

لئے خاص ہے کہا گیا ہے شعر

فلا تحسبن هندً لها الغدر وحدها	تم یہ نہ سمجھو کہ بے عہدی ہندہ کی کوئی مخصوص چیز
سجیة نفس کل غانیة هند	بلکہ یہ تو ہر نفس کی عادت ہے لہٰذا ہر حسین
	عورت کو ہندہ ہی کی طرح بدعہد تصور کرنا چاہیے۔

بلکہ یہ تو رجوع امر ازلی ہے جو نوع بشر کے حق میں مقدر کر دیا گیا ہے اس کے برخلاف تصور ہی نہیں کیا جا سکتا الا یہ کہ سنت الٰہی میں ہی تبدیلی ہو جائے مگر اس کی توقع کبھی نہیں ہے بنا بریں جو آدمی جہالت اور کفر میں بالغ ہوا ہے اس پر اپنی جہالت اور کفر سے توبہ کرنا ضروری ہے۔ اور جو شخص اپنے والدین کے زیر سایہ بحالت ایمان اصل حقیقت ایمان سے بے خبر رہ کر بالغ ہوا ہے اس پر ایمان کی حقیقت سے بے خبری سے توبہ کرنا واجب ہے کیونکہ اس شخص کو والدین کے اسلام سے کوئی نفع نہ ہوگا تاوقتیکہ وہ خود اسلام قبول نہ کرے اس لئے اگر وہ صاحب فہم ہے تو اس پر واجب ہے کہ اپنے سابق رذائل اور شہوات سے بیچھے بغیر کسی روک ٹوک کے پڑے رہنے سے رجوع کرے اپنے آپ کو قابو میں رکھے اور بے قید کر دینے اور اپنے کو آزادی یا چھوٹ دینے میں احکام الٰہی کے سانچے میں ڈھل کر رجوع کرے۔ یہ کام توبہ کے ابواب میں سے بہت مشکل باب ہے جس سے اکثر لوگ عاجز ہیں لہٰذا آیت بالا اس بات پر صریح دلالت کرتی ہے کہ توبہ ہر شخص کے لئے فرض عین ہے۔ کسی

فرد بشر کے بارے میں یہ تصور صحیح نہیں ہے کہ وہ توبہ سے بے نیاز ہے جب آدم علیہ السلام اس سے بے نیاز نہ رہ سکے تو اولاد کی فطرت میں اس چیز کی گنجائش کہاں سے آسکے گی جس کی گنجائش سرے سے باپ ہی کی فطرت میں نہ رہی ہو بہرکیف توبہ کے ہر وقت واجب ہونے کی بات تو!

فهو اذن كل بشر فلا يخلو عن معصية بجوارحه اذ لم يخل عنه الانبياء كما ورد في القرآن والاخبار من خطايا الانبياء وتوبتهم وبكائهم۔

اس میں شبہ نہیں کہ کوئی فرد بشر جسمانی اعضا کی ہر معصیت سے خالی نہیں ہے کیونکہ جب اس سے انبیاء علیہم السلام بھی خالی نہیں رہ تو دوسروں کا سوال ہی کیا ہے جیسا کہ قرآن پاک اور احادیث میں ان کا اپنی خطاؤں سے توبہ کرنے اور رونے گڑگڑانے کا ذکر موجود ہے

پھر اگر کوئی شخص کسی وقت جسمانی اعضا کے گناہ سے بچ بھی جائے تو گناہوں کے تصور سے تو خالی نہیں ہوگا اور اس سے بھی کسی وقت خالی مان لیا جائے تو خدا کے ذکر سے غافل کر دینے والے متفرق خطرات جو شیطانی وسوسوں کی وجہ سے ہوتے ہیں ان سے خالی نہ ہوگا اگر ان سے بھی خالی مان لیا جائے تو کم از کم خدا کی ذات و صفات اور اس کے افعال کے سلسلہ میں بے علمی یا نقصان علم سے تو خالی نہ ہوگا اور یہ تمام چیزیں

بہرحال ایک قسم کا نقص ہی یہ ہی جن کیلئے کچھ اسباب و وجوہ ہیں لہٰذا
ان کے اسباب کو اس طرح چھوڑ دینا کہ منافی جو چیز ہے اس میں مشغول ہو جائے
یہ بھی ایک واسطہ سے اس کی ضد کی طرف رجوع کرنا ہوا پس کسی آدمی کے
بارے میں اس نقص سے بری ہونے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں اس
نقص کی مقدار میں فرق (افراد بنی آدم کے درمیان) ضرور ہے لیکن جہاں
تک اصل نقص کا معاملہ ہے وہ تو بہرحال موجود ہے۔ اسی لئے حضور اکرم صلی
اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میرے قلب پر بھی ابر غفلت چھا جاتا ہے۔
یہاں تک کہ میں دن رات میں ستّر مرتبہ خدا سے استغفار کرتا ہوں
اور یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے لیغفر لک اللہ ما
تقدم من ذنبك وما تأخر سے خطاب فرما کر اعزاز بخشا ہے۔

واذا كان حالہ فکیف حال ! | پس جب یہ حال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے
غیرہ (احیاء العلوم صفحہ ۴۴/۴) | تو دوسروں کا کیا ہوگا (خود غور کر لو)

امام غزالیؒ کے اس طویل بیان کا یہی حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نوع
بشر کی فطرت میں خیر و شر کا امتزاج رکھا ہے اس لئے شر کی
طرف اس کا میلان فطری تقاضہ کے تحت ہے لیکن جن کی عقل جس درجہ
کامل ہوتی ہے اور جن کے صفات فرشتگانہ جس قدر قوی ہوتے ہیں
وہ اسی درجہ شیطانی خواہشات اور شر کے تقاضوں سے دور ہوتے جاتے

ہیں۔ یہ قاعدہ تمام بنی آدم کے لئے عام ہے اور سارے افرادِ بشر کا اس قاعدے سے تعلق برابر رہے گا ہے کوئی فردِ بشر حتّٰی کہ انبیاء کرام بھی اس نقص سے خالی نہیں ہیں البتہ ان کے حسبِ مراتب اس نقص کی مقدار میں فرق ضرور ہوگا۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ کوئی فرد اس نقص سے خالی ہو۔ مذکورہ عبارت میں کوئی جملہ ایسا نہیں ہے جس سے عصمتِ انبیاء کے مسئلے پر کوئی زد پڑتی ہو۔ باقی امام غزالیؒ نے انبیاء کرامؑ سے خطاؤں کے صدور پر توبہ کرنے وغیرہ کے بارے میں جو قرآن و حدیث کا حوالہ دیا ہے وہ اگرچہ اپنی جگہ درست ہے۔ لیکن اس کے اندر بھی امام غزالیؒ نے کسی ارادی گناہ کی نسبت انبیاء کرامؑ کی طرف نہیں کی ہے بلکہ بلا ارادہ ہونے والے گناہ یعنی لغزش اور خطا کی نسبت انھوں نے انبیاءؑ کی طرف کی ہے جس سے خواہ مخواہ احمد امین مصری صاحب نے انبیاءؑ کی بے عصمتی کا نظریہ کشید کرلیا ہے۔ آئندہ صفحات میں اس اجمال کی تحقیق آرہی ہیں۔ جن سے امام غزالیؒ کی اس عبارت کا مفہوم زیادہ واضح ہوجائے گا لیکن اتنی بات تو اس جگہ پر بھی بتائی جاچکی ہے کہ امام غزالیؒ نے عصمت کا انکار نہیں کیا ہے بلکہ ہر انسان میں خواہشات اور ان کے تقاضوں کے موجود ہونے کا دعویٰ کیا ہے جو اپنی جگہ حق ہے کیونکہ پہلے بھی یہ بات واضح طریقے پر گذرچکی ہے کہ عصمت کا مفہوم اہلسنت والجماعت کے

نزدیک گناہ کی صلاحیتوں سے محرومی یا سلب امکان اور بے اختیاری نہیں ہے اس لئے امام غزالیؒ کی عبارت میں عصمت انبیاءؑ کے خلاف کوئی چیز نہیں ہے یہ اور بات ہے کہ احمد امین مصری نے اپنی کج فہمی اور ایک خاص ذہنیت کی وجہ سے اس عبارت کو اپنے لئے سند بنالیا ہے حالانکہ یہ کسی طرح درست نہیں ہے البتہ معتزلہ اور شیعہ کے نزدیک عصمت سلب امکان کے ہم معنی ہے۔

عصمت کی حقیقت میں اختلاف کا نتیجہ

اہلسنت، شیعہ اور معتزلہ کے مابین عصمت کی حقیقت میں اس بنیادی اختلاف کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اہلسنت کے نزدیک معصوم کی ذات میں چونکہ قدرت و امکان موجود ہے اس لئے اس سے ہر قسم کے گناہ کا وقوع عقلاً جائز ہوگا اگرچہ عصمت کے سبب یہ چیز وجود پذیر نہیں ہو سکتی۔ اس کے برخلاف شیعہ اور معتزلہ کے نزدیک چونکہ معصوم گناہ کی قدرت سے محروم ہے اور اس کے اندر کسی گناہ کی صلاحیت ہی سرے سے موجود نہیں اس لئے کسی معصیت کا امکان بھی عقلاً اس سے نہیں ہو سکتا جیسا کہ اس بات کا امکان شرعاً بھی نہیں ہے۔ اختلاف کے اس ثمرہ کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھا جا سکتا ہے وہ یہ کہ اندھے آدمی میں جس طرح قوت بینائی موجود نہیں اس لئے کسی غلط چیز کو دیکھنا اس کے لئے نہ عادۃً ممکن ہے نہ شرعاً و عقلاً

میں اس کی گنجائش ہے اس کے برخلاف جس شخص کے اندر قوت بینائی
اچھی طرح موجود ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے ارادہ و اختیار سے
کسی غلط چیز پر نگاہ نہیں ڈالتا اگرچہ اس کے لئے یہ امر ممکن ہے کہ جب چاہے
نگاہ ڈالے لیکن خدا وند تعالیٰ کے فضل و کرم نے اس شخص کی حفاظت کر رکھی ہے
کہ اس کی طبیعت کو ہر غلط چیز سے متنفر کر دیا ہے جس کے سبب وہ کسی غلط چیز
کی طرف نگاہ نہیں اٹھاتا۔ اہلسنت کے نزدیک معصوم کی مثال دوسرے شخص
کی سی ہے اور معتزلہ کے نزدیک معصوم پہلے شخص یعنی اس اندھے کی طرح
ہے گناہ ہونے کے عقلی جواز اور شرعی عدم جواز کا مطلب بھی یہی ہے۔ چنانچہ
علامہ عبد العلی بحر العلوم اور علامہ محب اللہ بہاری مسلم الثبوت اور اس کی
شرح فواتح الرحموت میں لکھتے ہیں۔

اختلفوا فی عصمة الانبیاء قبل	لوگوں میں نبوت کے پہلے انبیاء کرام علیہم السلام
النبوة	کی عصمت کے مسئلہ کے اندر اختلاف ہے۔
فالاکثرون من المسلمین علی	لیکن زیادہ مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ عقلاً
انه لایمتنع عقلاً ذنب منهم	ان سے کوئی گناہ بھی ناجائز نہیں ہے
مطلقاً ای ذنب کان	صغیرہ ہو یا کبیرہ یا کفر ہی کیوں نہ ہو بخلاف
صغیرة او کبیرة او کفراً	شیعہ کے اس لئے کہ وہ لوگ انبیاء کرام
وقوعه خلافا للشیعة	پر مطلق کسی گناہ کو بھی عقلاً جائز نہ

نعم هم لا يجوزون عقلاً ذنباً عليهم مطلقاً وخلافاً للمعتزلة الا في الصغيرة فانهم يجوزونها (روح المعانی تفسیر)

نہیں مانتے اور بخلاف معتزلہ کے کیونکہ وہ بھی صغیرہ کے علاوہ کسی گناہ کو انبیاء کے لئے عقلاً جائز نہیں قرار دیتے ہیں۔

اس عبارت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اکثر مسلمانوں کے نزدیک قبل نبوت معاذ اللہ نبی ہر قسم کے گناہ میں ملوث ہو سکتا ہے کیونکہ ان کے نزدیک شرعاً یہ بات کسی طرح سے جائز نہیں ہے بلکہ اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ عقلاً اس کے اندر گناہ کی قدرت وصلاحیت موجود ہونے کے سبب گناہ بھی ممکن ہے اگرچہ شرعاً کبھی بھی اس کا وقوع نہیں ہوگا اس کے برخلاف شیعوں کے نزدیک نبی کے اندر گناہ کی قدرت ہی موجود نہیں لہٰذا جس طرح شرعاً وقوع ناجائز ہے اسی طرح عقلاً بھی ناجائز ہوگا معتزلہ کا بھی یہی خیال ہے۔

قاضی ابوبکر کی طرف یہ انتساب غلط ہے

البتہ اہلسنت میں سے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ شرعاً بھی قبل نبوت ہر معصیت جائز ہے اگرچہ کفر ہی کیوں نہ ہو مگر بعد نبوت شرعاً جائز نہیں چنانچہ علامہ آلوسی روح المعانی میں تحریر فرماتے ہیں۔

نعم لا اشکال فیه علی ما قاله القاضی ابو بکر من انه

ہاں قاضی ابوبکر کے مذہب کے مطابق اس میں کوئی اشکال نہ ہوگا کیونکہ وہ کہتے

لا یمتنع عقلاً ولا سمعاً ان یصدر من النبی علیہ السلام قبل نبوتہ معصیۃ مطلقاً بل لا یمتنع عقلاً ارسال من اسلم بعد کفرہ (روح المعانی ج ۱۶ ص ۱۷۶)

یہ عقلاً اور شرعاً یہ بات ممکن ہے کہ نبی سے قبل نبوت ہر طرح کی معصیت کا ذکر ہو جائے بلکہ یہ بھی محال نہیں کہ خدا ایسے شخص کو رسول بنا دے جو کفر کر چکا ہے لیکن اسلام لے آیا۔

اہلسنت میں کسی کی طرف بالخصوص قاضی ابو بکر کی طرف اس مسئلہ کو منسوب کرنا ہمارے نزدیک کسی طرح درست نہیں ہے۔ اولاً اس لئے کہ قاضی ابو بکر کے کہنے کا مقصود یہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک دوسری بات سمجھانا چاہتے ہیں مگر لوگوں نے شرعاً بھی قبل نبوت گناہ کا جواز حتیٰ کہ کفر کا جواز سمجھ لیا اور اسی کو ان کا مسلک سمجھ کر ان کی طرف منسوب کرتے ہیں خود علامہ آلوسی نے بھی اس رائے کو قبول نہیں کیا ہے اس لئے وہ قبل نبوت اور بعد نبوت نبی کے معصوم ہونے کی بار بار تصریح فرماتے ہیں جیسا کہ ان کی عبارت آگے آرہی ہے دیکھئے نمبر اس صفحہ ۳۴، صفحہ ۴۳ ثانیاً یہ مسئلہ آئندہ اوراق میں بے شمار حوالوں سے ثابت کیا جائے گا کہ شرعاً نبوت سے پہلے خوارج کے فرقہ ازارقہ اور شیعہ کے فرقہ فضلیہ کے علاوہ تمام امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کسی نبی سے قبل نبوت کفر جائز نہیں ہے اگر اہل سنت میں کسی معتبر بزرگ اور مستند عالم کو اس سے اختلاف ہوتا بالخصوص قاضی

ابوبکر کو بھی اس سے اختلاف ہوتا تو جس طرح ازارقہ اور فضلیہ کا اختلاف لوگوں نے نقل کیا ہے اس مقام پر قاضی ابوبکر کا اختلاف ضرور نقل کیا گیا ہوتا لیکن کسی ایک مستند عالم نے بھی نقل نہیں کیا ہے جس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ آلوسی علیہ الرحمۃ کو قاضی ابوبکر کی رائے سمجھنے کے متعلق غلط فہمی ہوئی ہے ورنہ قاضی ابوبکر بھی جمہور اہلسنت کی طرح قبل نبوت نبی کے لئے معصیت کو صرف عقلاً جائز کہتے ہیں جیسا کہ شرح فواتح الرحموت کے حوالے سے گزر چکا ہے۔

علاوہ اگر یہ نسبت قاضی ابوبکر کی طرف درست بھی تسلیم کر لی جائے تو باتفاق اہلسنت یہ رائے قابل قبول نہ ہوگی جیسا کہ آئندہ صفحات سے معلوم ہو جائے گا۔

ان مباحث کے سامنے آجانے کے بعد ناظرین یہ سمجھ گئے ہوں گے کہ مولانا مودودی نے رسائل و مسائل کے اندر جو بات تحریر کی ہے کہ نبی کی عصمت فرشتوں جیسی نہیں ہے اور عصمت سلب امکان کا نام نہیں ہے کہ گناہ پر قدرت ہی نہ ہو بلکہ عصمت کے باوجود گناہوں کا ارتکاب اس کے مقدور میں ہوتا ہے یہ بالکل صحیح اور درست ہے بلکہ یہ ایک مسئلہ ہے جس کی وضاحت اب تک پیش کی گئی ہے۔ مولانا مودودی کے اس نظریہ پر کسی کو اعتراض نہیں ہے ان کا جو نظریہ قابل اعتراض ہے

دو یہ ہے۔

کیا عصمت لازم ذات ہے

مولانا مودودی کے نزدیک نہ تو عصمت لازم ذات ہے اور نہ ہی نبوت سے پہلے عصمت کسی نبی کو حاصل ہوتی ہے چنانچہ مودودی صاحب کی یہ عبارتیں کسی تشریح و وضاحت کی محتاج نہیں ہیں۔

۱۔ عصمت دراصل انبیاء علیہم السلام کے لوازم ذات سے نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو منصب نبوت و رسالت کی ذمہ داریاں صحیح طور پر ادا کرنے کے لیے مصلحتاً خطاؤں اور لغزشوں سے محفوظ فرمایا ہے (تفہیمات)

۲۔ اور قبل نبوت کسی نبی کو وہ عصمت حاصل نہیں ہوتی جو نبی ہونے کے بعد ہوا کرتی ہے (رسائل و مسائل ص ۳۴ اول)

۳۔ نبی ہونے کے پہلے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی ایک بہت بڑا گناہ ہو گیا تھا کہ انہوں نے ایک انسان کو قتل کر دیا چنانچہ جب فرعون نے ان کو اس فعل پر ملامت کی تو انہوں نے بھرے دربار میں اس بات کا اقرار کیا کہ فعلتہا اذاً وانا من الضالین (رسائل و مسائل اول ص ۳۱)

بالترتیب ہم مودودی صاحب کے دونوں نظریے کا تحقیقی جائزہ ناظرین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

لازم ذات کی تحقیق

درحقیقت عصمت کے لازم ذات

نہ ہونے کا نظریہ اس امر پر مبنی ہے کہ مقام نبوت و رسالت پر سرفراز ہونے سے پہلے نبی عام انسانوں کی طرح ہوتا ہے یعنی عام انسانی طبیعتوں اور ذات نبوت کی طبیعت و مزاج میں کوئی فرق نہیں ہوتا حالانکہ سرے سے یہ خیال ہی صحیح نہیں ہے کیونکہ قبل نبوت بھی نبی کی ذات عام انسانی طبیعتوں سے مختلف ہوتی ہے اور خیر و صلاح اور عقیدہ و عمل کی پاکیزگی قبل نبوت سے ہی بلکہ پیدائشی طور سے ذات نبوت میں ودیعت کی جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ عام انسانوں سے بالکل مختلف ہوتے ہیں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں۔

تحقیق آنکہ نفوس قدسیہ انبیاء علیہم السلام در غایت صفا و علو فطرت آفریدہ شدہ است و در حکمت الٰہی ہمانا صفا و علو فطرت مستوجب وحی گشتہ اند و در بایست عالم مفوض شدہ قال اللہ تعالیٰ اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ

(ازالۃ الخفا ص ۲۰)

- - - - - - - - - - -

اصلیت تحقیق یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے پاک نفوس بے انتہا پاکیزہ اور عالی فطرت پیدا کئے جاتے ہیں۔ اور خدا وند قدوس کے انتخاب حکیمانہ میں وہ اسی پاکیزگی اور عالی فطرت ہونے کی وجہ سے وحی رسالت و نبوت کے مستحق ہو جاتے ہیں اور سارے عالم کی اصلاح کا معاملہ ان کے سپرد ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ خدا خوب اچھی طرح جانتا ہے اس جگہ کو جہاں رسالت کو رکھے گا

ایک دوسرے موقع پر شاہ صاحب نے مزید تشریح و وضاحت بھی فرمائی ہے لکھتے ہیں۔

و از لوازم[1] نبوت و بشرط اعجاز تمییز این شخص است که پیغامبری او و استعداد سائر افراد بشر در پردہ قوت نفس الطقو یعنی قوت عاقلہ و قوت عملیہ و الیہ الاشارۃ فی قولہ تعالیٰ اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ ۔۔۔ و تحقیق ۔۔۔ در قوت عاملہ او مرد سے کی در ہر کہ سبب آں حسنت صالح نصیب او شود با اجتناب معاصی و رعایت آداب طاعات و تدبیر منازل و

جس شخص کی رسالت جاری کی گئی ہے اس کی ذات نبوت کے لوازم اور اجزائے امتیاز میں سے یہ بات ہے کہ وہ تمام افراد بشر سے دونوں صلاحیتوں میں ممتاز ہو یعنی عقلی صلاحیت اور عملی صلاحیت، اسی طرف اللہ تعالیٰ اپنے قول اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ میں اشارہ فرما رہے ہیں۔ ۔۔۔ رہیا کہ عقلی استعداد کے متعلق گزرا اسی طرح اس نبی ہونے والے شخص کی قوت عملی کی ترغیب مزید کی جاتی ہے جس کی وجہ سے نیک رجحان اس کا مقدر بن جاتا ہے اور گناہوں سے

[1] لوازم نبوت کا ترجمہ لازم ذات اس لئے کیا گیا کہ گفتگو نبی نبوت کی زندگی سے متعلق ہے جو نبوت کہ ذات نبوت وصف نبوت سے خالی ہے چنانچہ خود شاہ صاحب کی تصریح بھی آگے آرہی ہے کہ عصمت صفت ذات ہے نہ صفت نبوت۔

کہ ذاتِ نبوت کے لیے عصمت یعنی گناہوں سے گریز کرنا ایک امر لازم ہے جو نبوت کے پہلے ہی سے موجود رہتا ہے بلکہ غور کرنے سے یہ بات اور واضح ہوتی ہے کیونکہ عصمت کے حاصل ہونے یا پائے جانے کے بہر حال کچھ اسباب و وجوہ ہوں گے اگر وہ اسباب و وجوہ قبل نبوت موجود ہوں تو پھر عصمت کے قبل نبوت موجود نہ ہونے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہو سکتی۔ پس اس صورت میں عصمت لامحالہ لازمِ ذات ٹھہرے گی۔

چنانچہ اس سلسلہ میں خود شاہ صاحب ہی تحریر فرماتے ہیں۔

والعصمة لها أسباب ثلاثة	عصمت کے تین اسباب ہیں (۱) اول یہ کہ
أن يخلق الإنسان نقيا عن	انسان کی تخلیق ہی شہوانی رذائل سے منزہ
الشهوات الرذيلة صحيحا	نیز بالکل سادہ لوحی پر ہو بالخصوص ان
وسجيتها فيما يرجع الى محافظة	امور میں جن کا حدود شرعیہ کی حفاظت
الحدود الشرعية و	و نگرانی سے تعلق ہے (دوم) یہ کہ اس کے
أن يوحى اليه حسن الحسن	پاس اچھے کام کی بھلائی اور برے کام
وقبح القبيح وما لهما	کی برائی ان دونوں کا انجام حتمی وحی آ جائے
وأن يحول الله بينه	(سوم) یہ کہ خود اللہ تعالیٰ اس کے اور
بين ما يريد من الشهوات	شہوانی رذائل کے قصد کے درمیان

الرذيلة (حجۃ اللہ البالغۃ [illegible]) حائل ہو جائے۔

ایک مقام پر شاہ صاحب نے اس سے بھی زیادہ مسئلہ کی تشریح و توضیح فرمائی ہے لکھتے ہیں۔

اعلم ان العصمۃ لہا اسباب ثلثۃ احدہا ان یخلقہم فی سذاجۃ الفطرۃ وکمال اعتدال الاخلاق فلا یرغبون فی المعاصی بل یکونون متنفرین عنہا وثانیہا ان یوحی الیہم ان المعاصی یعاقب علیہا والطاعات یثاب علیہا فیکون ذالک رادعا عن المعاصی وثالثہا ان یحول اللہ تعالیٰ بینہ وبین المعاصی باحداث لطیفۃ غیبیۃ کظہور صورۃ یعقوبؑ عاضا علی اصبعہ فی قصۃ یوسفؑ قالہ ولی اللہ الدہلوی [illegible]

ذہن نشین کرلو کہ عصمت کے اسباب تین ہیں ایک یہ ہے کہ ان معصوموں کو اللہ تعالیٰ نیک طبیعت اور اعلیٰ درجہ کے معتدل اخلاق پر تخلیق فرماتا ہے اس لئے گناہوں سے گریز کرتے ہیں بلکہ اس سے متنفر رہتے ہیں۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ ان کے پاس وحی آتی ہے کہ معاصی پر سزا دی جائے گی اور اعمال خیر پر ثواب ملے گا پس یہ چیز بھی معاصی کے ارتکاب سے روک بن جاتی ہے تیسرا سبب یہ ہے کہ خود اللہ تعالیٰ ان کے اور معاصی کے درمیان ایک پاکیزہ لطیفہ پیدا کرکے حائل ہو جاتا ہے جیسے حضرت یعقوبؑ کی تصویر ظاہر ہوئی تھی حضرت یوسفؑ کے واقعہ میں انکی انگلی پر۔

عصمت کے ان اسباب و وجوہ پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہے
کہ ان میں دو سبب نزول وحی اور زمانۂ نبوت کے پہلے بھی موجود ہوتے
ہیں یعنی پہلا سبب اور تیسرا سبب ۔ لہٰذا ان دونوں اسباب و وجوہ کا ہونا اس
بات کی مضبوط دلیل ہے کہ عصمت بھی قبل نبوت موجود ہوتی ہے یہ اور بات
ہے کہ عصمت قبل نبوت اس درجہ قوی نہیں ہوتی جس درجہ کی زمانۂ نبوت
میں ہوتی ہے لیکن نفس وجود کا انکار کسی طرح درست نہیں ہے ۔

قبل نبوت بھی انبیاء کرام کی زندگی ممتاز ہوتی ہے

انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے زمانۂ نبوت سے پہلے کی زندگی کو عام انسانوں کی زندگی جیسا
تصور کرنا غلط خیال ہے جس کے ابطال و تردید کی طرف شاہ ولی اللہ صاحب نے بار بار
توجہ فرمایا ہے اور قبل نبوت کا امتیاز زندگی یعنی علم و عمل میں عام انسانی زندگیوں کے مقابلہ میں
قبل نبوت دونوں پہلوؤں سے انبیاء کرام کی زندگی فائق و بلند ہوتی ہے
اس عقیدے کو شاہ ولی اللہ صاحب نے پوری قوت کے ساتھ اپنے خاص حکیمانہ
انداز میں مختلف طریقے سے ثابت کیا ہے چنانچہ عصمت قبل نبوت کے سلسلے
میں ان کا یہ حقیقت افروز بیان قابل دید ہے ۔ فرماتے ہیں ۔

پس نبوت امرے است حادث بسبب	پس نبوت ایک ایسی چیز ہے جو اصلاح عالم
تعلق ارادہ بہ بعث ایں پیغامبر بجہت	کے لئے اس پیغمبر کی بعثت سے ارادۂ الٰہی

اوور نہایت صاف را

ولہٰذا عصمت صفت او می باشد
واین امور لازم اعظم نبوت
است و سنت اللہ بآن جاری
شدہ کہ نبوت عنایت نفرمایند
مگر کسے را کہ چنین آفریدہ شدہ
باشد و بسا مردم اصحاب نفوس
قدسیہ کہ بعض این اوصاف
یا اکثر آن متصف باشند
نبوت نصیب ایشان نباشد
چنانچہ مثل مشہور است کہ

مصرعہ

گور خر گرفت مگر آنکہ دوید
نہ ہر آنکہ دوید گورخر گرفت

. . . .

. . . .

ولا یکلف من یسعی یصیبہ غزالہ

وہی قبول کر لیتا ہے اور اس کی قوت عمل
بھی بے انتہا درست ہوتی ہے اسی لئے
عصمت اس شخص کی صفت ہو جاتی ہے
یہ چیزیں نبوت کے عظیم لوازم میں سے
ہیں عادۃ اللہ اسی طرح جاری ہے کہ
نبوت صرف ایسے ہی شخص کو عطا کی جاتی
ہے جو ان اوصاف کے ساتھ پیدا کیا
گیا ہو اور کتنے قدسی صفات انسان
ہیں جن کے اندر ان اوصاف میں سے بعض
یا اکثر موجود ہیں لیکن نبوت میں ان کا
حصہ نہیں ہو سکتا جیسا کہ مشہور مثل ہے

مصرع؎ گورخر گرفت مگر آنکہ دوید
نہ ہر آنکہ دوید گورخر گرفت

(ہر کوشش کرنے والا ہرن شکار نہیں کر لیتا
ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ جس نے ہرن
شکار کر لیا ہے اس نے کوشش ضرور کی ہے)

مصرع؎ ہر کوشش کرنے والا ہرن شکار نہیں کر لیتا

ولکن من صاد العز المقدحی — لیکن یہ بات ہے کہ جس نے ہمت تلاش کر لیا ہے اس نے کوشش میں فیروزی کی ہے

قال اللہ تعالیٰ : — اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ — خدا اس کو خوب جانتا ہے جس کے رسول بنانے کا ارادہ رکھتا ہے۔

(ازالۃ الخفاء جلد اول صفحہ ۵۲)

اس طویل اقتباس میں خط کشیدہ عبارت اس بات کی صریح دلیل ہے کہ عصمت لازم ذات ہوتی ہے نہ کہ لازم نبوت۔ کیونکہ عصمت اگر وصف نبوت کا لازمہ ہوتی تو شاہ صاحب " لہٰذا عصمت صفت نبوت می باشد" تحریر فرماتے و صفت اولی باشد" ہرگز نہ لکھتے۔

بہرحال قبل نبوت کے سلسلہ میں شاہ ولی اللہ صاحب کی منقولہ بالا عبارتوں میں اس تشریح کے علاوہ دو آیتوں کی طرف اشارہ بھی پایا جاتا ہے جو در اصل عصمت قبل نبوت کی دلیل ہیں۔ پہلی آیت یہ ہے

اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ — اللہ خوب جانتا ہے اس جگہ کو جہاں وہ رسالت رکھنے والا ہے۔

آیت اپنے مفہوم میں بالکل صریح ہے کہ جس شخص کا انتخاب رسالت و نبوت کے لیے خداوند تعالیٰ فرماتے ہیں اس کے اندر ایسے صفات و کمالات ضرور ہوتے ہیں جن کی بنا پر وہ شخص اس منصب جلیل کا اہل قرار پاتا ہے

چنانچہ امام رازیؒ فرماتے ہیں۔

فالمعنى ان للرسالة موضعا مخصوصا موصوفا بتلك الصفات التى يجعلها يصلح لوضع الرسالة فيه كان رسولا والا فلا۔

(تفسیر کبیر صفحہ ۱۴۲ ج ۱۳)

مطلب یہ ہے کہ رسالت و نبوت کے لیے ایک مخصوص جگہ ہے کہ جس کے سوا کسی اور جگہ اس کا رکھنا درست ہی نہیں لہٰذا جو ذات مخصوص اور ان صفات سے موصوف ہوگی کہ جن کے سبب سے وہ مقام رسالت کے اہل قرار پائے۔ وہی رسول بنائی جائے گی ورنہ نہیں۔

امام رازیؒ کی اس عبارت کا خلاصہ بھی یہی ہے کہ جس ذات کو آئندہ چل کر رسالت و نبوت کے مقام پر فائز ہونا ہے وہ قبل نبوت سے ہی فطری طور پر دوسرے تمام نفوس کے مقابلہ میں نہایت پاکیزہ، عالی کردار، نیک سیرت اور صالح ہوتی ہے یعنی وہ جوہر قابل اپنے حسن عمل اور ذاتی استعداد کی وجہ سے رسالت و نبوت کا مستحق ہوتا ہے اسی لیے نگاہ انتخاب بھی اسی پر پڑتی ہے۔ ایسا نہیں کہ دوسرے انسانوں کے درمیان اور اس کے درمیان کسی طرح کا کوئی فرق نہ ہو اس کے باوجود خداوند تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے عطائے خاص کے ذریعہ نبی یا رسول بنا دیا ہو بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ شخص اپنے اندر ایسے اوصاف و

کمالات رکھتا ہے جو اس کو نبوت و رسالت کا مستحق بنا دیتے ہیں اور اسی اہلیت کی وجہ سے پروردگار عالم اس کو اپنے فضل و کرم سے نوازتے ہیں اور منصب نبوت پر فائز کرتے ہیں ان کے یہ اوصاف اگرچہ نبوت و رسالت دینے پر خداوند تعالیٰ کو مجبور نہیں کرتے تاہم اس کے حصول کا مستحق ضرور بنا دیتے ہیں لیکن خداوند تعالیٰ کو اس فیصلہ پر مجبور اس لئے نہیں کرتے بلکہ جو سرتاپا قابل ہونے کے باوجود اگر خدا چاہے تو اس کو شرف نبوت عطا نہ کرے اگرچہ اس کا مستحق ہی کیوں نہ ہو۔ علامہ آلوسی علیہ الرحمۃ اسی آیت کے تحت فرماتے ہیں۔

والمعنى أن منصب الرسالة ليس مما ينال بما يزعمونه من كثرة المال والولد وتعاضد الأسباب والعُدد وإنما ينال بفضائل نفسانية ونفس قدسية أفاضها الله تعالى بمحض الكرم والجود على من كمل استعداده ونص بعضهم على أنه تابع

معنی یہ ہے کہ منصب رسالت مال و اولاد کی کثرت اسباب و سامانات کی فراوانی کے ذریعہ نہیں ملتا ہے جیسا کہ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ منصب تو ذاتی کمالات اور طہارت نفس کے سبب ملتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل و کرم سے اس شخص کو عنایت فرماتے ہیں جس کے اندر اس کی پوری طور پر اہلیت پائی جاتی ہے اور بعض اہلسنت نے اس بات کی تصریح فرمائی ہے کہ منصب رسالت

لا استعداد الذاتي
هو لا يستلزم الايجاب الذي
يقوله الفلاسفة لانه
سبحانه ان شاء اعطى
ان شاء امسك وان استعد
المحل وما في المواقف من
انه لا يشترط في الارسال
الاستعداد الذاتي
بل الله يختص برحمته
من يشاء محمول على
الاستعداد الذاتي
الموجب فقد جرت
عادة الله تعالى ان
يبعث من كل
قوم اشرفهم
اطهرهم جبلة
وتمام البحث

ور نبوت ذاتی صلاحیت کے تابع ہوتا ہے
لیکن اس کا مطلب لازمی وجوب نہیں ہے
ور جو اہلیت والے کے لئے رسول بنا دینا خدا
کے ذمہ ضروری ٹھہرے، جیسا کہ فلاسفہ کا
کہنا ہے کیونکہ وہ اہلیت و استعداد کے
باوجود اگر خدا چاہے تو دے اور اگر
نہ چاہے تو نہ دے اگرچہ محل میں استعداد
موجود ہو۔ باقی مواقف کے اندر جو لکھا
ہے کہ رسالت عطا کرنے کے لئے ذاتی
استعداد شرط نہیں ہے بلکہ اپنی
رحمت سے جس کو چاہتا ہے خاص کر لیتا
ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ استعداد
ذاتی شرط نہیں ہے جو لازمی طور پر
رسالت کو واجب کر دے کیونکہ عادت
اللہ اسی طرح جاری ہے کہ ہر قوم سے
رسالت کا انتخاب اس شخص کے حق میں ہوتا
ہے جو ان میں اشرف، عاقل اور پاکیزہ

فی موضعہ — فطرت ہوتا ہے اور مسئلہ کی مکمل تفصیل

(روح المعانی صفحہ ۲۲۳، ۲۲۴ ج ۸) — اپنے مقام میں مل سکتی ہے۔

دوسری آیت جس طرف شاہ ولی اللہ صاحب نے اشارہ فرمایا تھا وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ سے متعلق ہے کہ قبل نبوت زلیخا کے ساتھ ان کو جو واقعہ پیش آیا وہاں عصمت خداوندی ہی نے ان کو گناہ سے محفوظ رکھا ورنہ اس کے سارے اسباب و دواعی مکمل ہو چکے تھے۔ خدائی حفاظت شامل حال نہ ہوتی تو بچنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا — اور زلیخا تو پختہ ارادہ کر ہی چکی تھی اور
لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ — (حضرت یوسف علیہ السلام) بھی کر بیٹھتے اگر
(پارہ ۱۲ رکوع ۱۳) — اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لیتے۔

یعنی خدائی عصمت ہی درمیان میں حائل ہو گئی تھی جس نے حضرت یوسفؑ کو اس اقدام سے باز رکھا۔ خود زلیخا کا بیان بھی قرآن میں اس طرح منقول ہے فرمایا گیا۔

وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ — میں نے تو اس کو پھسلانا چاہا
فَاسْتَعْصَمَ — مگر اس نے عصمت کو کام میں لایا۔
. . . . . . — اور اس لئے محفوظ رہا۔

عصمت قبل نبوت کی اس سے واضح اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ خود واقعہ کی تعبیر میں خدا وند تعالیٰ نے "استعصم" کا لفظ استعمال فرمایا ہے تاکہ قبل نبوت عصمت کا واضح ثبوت ہو جائے۔ ان وضاحتوں کے سامنے آ جانے کے بعد عصمت کے لازم ذات ہونے سے انکار کیلئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی ہے کیونکہ دلائل سے ثابت ہو گیا کہ قبل نبوت بھی اللہ تعالیٰ کی خصوصی توجہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہوتی ہے اور وہ ہمیشہ خداوند تعالیٰ کی نگرانی اور اسی کی حفاظت میں ہوتے ہیں۔ اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں اہلسنت میں سے کسی ایک فرد کا بھی کوئی اختلاف نہیں ہے البتہ اس عصمت کی قوت اور اس کا عمل کس حد تک گناہوں سے روکتا ہے اس مسئلہ میں کچھ تفصیل ہے۔

گذشتہ صفحات

کیا عصمت زمانۂ نبوت و رسالت کے پہلے بھی ہوتی ہے

میں جو تحقیقات تحریر کی جا چکی ہیں ان سے یہ حقیقت بالکل بے غبار ہو گئی ہے کہ عصمت زمانۂ نبوت کے پہلے سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اپنی پہلی زندگی پر چیلنج کرتا ہے اور اس کو اپنی بے گناہی اور صداقت کی دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا   میں تمہارے درمیان ایک زمانہ تک

مِن قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ	(دعویٰ نبوت و رسالت کے پہلے بھی رہ چکا
(سورۂ یونس)	ہوں کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے ہو۔

علامہ آلوسی علیہ الرحمہ اسی آیت کی تفسیر میں ایک معنیٰ یہ بھی بیان فرماتے ہیں۔

والمعنی قد عشت فیما بین	مطلب یہ ہوا کہ میں نے تمہارے ہی درمیان
ظهرانیکم قبل الوحی لا	رہ کر وحی کے قبل بھی اپنی زندگی گزاری ہے
اتعرض لاحد بشیئ منکم ولا	کہ کبھی کسی سے زیادتی کے ساتھ کوئی تعرض نہیں
جدال ولا خصومات	کیا اور نہ جنگ و جدل کیا اور کسی موقع پر کسی
مقال فیه متابعة	بات کے قریب بھی نہ پھٹکا جس میں جھوٹ کے
شبهة نقلا عنه	شبہ کا بھی کوئی شائبہ ہو اور جھوٹ یا الزام
فیه کذب وافتراء الا	تراشی تو بڑی چیز ہے کیا تم لوگ ان باتوں
تلاحظونه (روح المعانی ص ۱۱ ج ۱۱)	پر غور نہیں کرتے ہو۔

یہ آیتیں اس بات کا واضح ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ زمانۂ نبوت کے قبل بھی کوئی نبی عام انسانوں کی طرح نہیں ہوتا ہے۔ ایک نبی کی ذات کے درمیان اور دوسرے انسانوں کے درمیان جو واضح فرق ہے اس کو تسلیم نہ کرنا پلے درجہ کی جہالت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ رہی یہ بات کہ زمانۂ نبوت سے قبل یہ عصمت ان کی ذات کو کن کن گناہوں سے محفوظ رکھتی ہے یہ ایک تفصیل طلب کلیہ

اتنی بات پر تو تقریباً پوری امت کا یا کم از کم اہلسنت کا بلا کسی اختلاف کے بالکل اتفاق و اجماع ہے کہ وہ قبل نبوت بھی کفر و شرک سے محفوظ ہوتے ہیں مسلم الثبوت   اس کی شرح فواتح الرحموت کے حوالہ سے گذر چکا ہے کہ عقل کی رو سے قبل نبوت ہر گناہ کا صدور ممکن ہے لیکن یہ صرف عقل کی بات تھی واقعہ کیا ہے اور جو چیز عملاً وقوع پذیر ہوئی ہے وہ شرعی حکم کیا ہے علامہ محب اللہ بہاری مسلم الثبوت میں اور علامہ عبد العلی بحر العلوم   اس کی شرح فواتح الرحموت میں گذشتہ عبارت کے متصلاً ہی یہ تحریر فرماتے ہیں۔

وامّا المتوارث	یعنی اوپر جو کچھ تحریر ہوا وہ تو عقلی بات تھی لیکن
من لدن آدم ابو البشر	جو وقوع پذیر ہوئی یعنی متوارث حقیقت ہے
الیٰ نبینا و مولانا	وہ یہ ہے کہ ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام سے
افضل الرسل و	لیکر ہمارے آقا اشرف الخلق حضرت محمد
اشرف الخلق محمد	صلی اللہ علیہ وسلم تک کسی ایسے شخص کو نبی
رسول اللہ صلی اللہ علیہ	نہیں بنایا گیا جو کسی وقت میں ایک لمحہ کے
وسلم انہ لم یبعث نبی	بھی شرک میں مبتلا رہ چکا ہو۔ اس بات
قط اشرک باللہ طرفۃ عین کذا	کی تصریح امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے
وعلیہ نص الامام ابو حنیفہ فی الفقہ الاکبر	بھی فقہ اکبر میں فرمائی ہے۔

فواتح الرحموت مسلم صفحہ

علامہ آلوسی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں۔

فالانبیاء معصومون عن	انبیاء کرام علیہم السلام نبوت سے پہلے
الکفر قبل النبوۃ وبعدھا	اور نبوت کے بعد بھی کفر سے معصوم
(روح المعانی ص۱۲/۱۹۶)	ہوتے ہیں۔

ایک طالب حق اور منصف مزاج کے لئے یہ ٹھوس حوالے کافی سے زیادہ ہیں لیکن معاند اور ہٹ دھرم سے صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم   چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

یہ تمام عبارتیں اپنے مفہوم اور مراد میں بالکل واضح اور صاف ہیں۔ کسی مزید تشریح کی مطلقاً کوئی ضرورت نہیں ہے البتہ یہ چیز ذہن نشین ہو جانی ضروری ہے کہ یہ مسئلہ اجماعی اور پوری امت کا متفق علیہ ہے۔ اگر کسی کا اختلاف ہے تو وہ ایسے ہی لوگ ہیں جن کا سواد اعظم سے خارج ہونا قطعی اور امت میں شامل ہونا خود ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے۔ چنانچہ علامہ آلوسی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں۔

لایکاد یقول بذالک الا الازارقۃ	انبیاء سے کبیرہ کے ارتکاب کا کوئی بھی
من الخوارج فانھم علیھم	خوارج کے فرقہ ازارقہ کے علاوہ اس بات
مایستحقون جوزو الکفر	کا قائل نہیں ہے کیونکہ یہ فرقہ علیہ ما علیہ
حیث ھم ضماد ونہ	معاذ اللہ انبیاء علیہم السلام کے لئے کفر کا

نشین کرنا مقصود ہے کہ تفضیلیہ اور ازارقہ کے علاوہ تمام اسلامی فرقے صدر اول

اعتقادی و عملی مسائل میں اختلاف کے باوجود اس نکتہ پر متفق ہو جاتے ہیں

کہ کسی نبی سے زمانۂ نبوت کے پہلے یا بعد کسی وقت کفر و شرک کا وقوع نہ

صدور نہیں ہوا ہے اگر اس اجماعی عقیدہ سے اختلاف ہے تو صرف مولانا مودودی

صاحب کو ہی اختلاف ہے بلکہ اہلسنت والجماعت کا تو مختار مسلک یہ ہے

کہ کفر و شرک کی ہی طرح تمام کبائر کے عمداً ارتکاب سے بھی قبل نبوت انبیاء

معصوم ہوتے ہیں۔

مذہب مختار کے مطابق باعتقاد | **انبیاء قبل نبوت کبائر سے بھی معصوم ہوتے ہیں**

کبائر سے معصوم ہوتے ہیں اہلسنت کے درمیان تو کوئی اختلاف نہیں ہے

بلکہ شیعہ حضرات اور اکثر معتزلہ بھی قبل نبوت کبائر کے عمداً وقوع سے نبی کو

معصوم ہی مانتے ہیں البتہ بعض معتزلہ وغیرہ اس سے اختلاف رکھتے ہیں لیکن

وہ اہلسنت اور امت کے سواد اعظم سے چونکہ خارج ہیں اس لئے ان کے اختلاف

سے کسی اجماعی مسئلے پر اثر نہیں پڑتا۔

زیادہ تر صفت عفار ابلی | **سہواً کبائر سے قبل نبوت معصوم ہونا مختلف فیہ ہے**

سلہ روح المعانی صفحہ ۱۲۴ ج ۱

قبل نبوت سہواً کبائر کا صدور جائز مانتے ہیں۔ بعض لوگوں نے اسی کو عمداً
و صحیح بھی قرار دیا ہے لیکن اکثر محققین سہواً کبائر سے بھی قبل نبوت معصوم ہونے
کو صحیح و مختار قرار دیتے ہیں اس جگہ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ جن لوگوں
نے کبائر کا صدور قبل نبوت یا بعد نبوت جائز قرار دیا ہے انھوں نے اس
کے ساتھ ہی ساتھ دو باتوں کی تشریح بھی کی ہے اول یہ کہ اتفاقی طور پر اگر
کسی کبیرہ کا صدور ہو جاتا ہے تو فوراً تنبیہ کر دی جاتی ہے اور وہ اس پر
قائم نہیں رہ پاتے بلکہ صدور سے پہلے ہی ارادہ اور خیال پیدا ہوتے وقت
ہی ان کو تنبیہ ہو جاتی ہے اور وہ اس سے باز رہتے ہیں۔ اس شرط کو ملحوظ رکھنے
کے بعد دونوں خیالوں کے درمیان کوئی اختلاف یا جوہری فرق باقی نہیں
رہ جاتا چنانچہ عصمت کے اجماعی قول اور بعضوں کے اس اختلاف کے درمیان
تطبیق کرتے ہوئے ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں۔

والجمهور جوزوا وقوع الكبائر
سهواً والصغائر عمداً لكن
المحققين منهم اشترطوا ان ينبهوا
عليهم فينتهوا عنه فحينئذ
قول الجمهور لا ينافي الاجماع
المذكور (مرقاة ص ۱۲۰)

جمہور نے کبائر کا سہواً اور صغائر کا عمداً
وقوع جائز مانا ہے لیکن ان کے محققین یہ
شرط لگاتے ہیں کہ ایسے امور پر انبیاء کرام
کو متنبہ کر دیا جاتا ہے اور وہ اس سے رک
جاتے ہیں لہٰذا اس توجیہ کے بعد جمہور کا
قول مذکورہ اجماع کے خلاف نہیں رہتا ہے۔

قائلین جواز نے جو دوسری بات اس جگہ ملحوظ رکھی ہے اس کو سامنے رکھنے کے بعد بھی یہ اختلاف ختم ہو جاتا ہے کیونکہ یہ حضرات اس بات کی تصریح کر رہے ہیں کہ یہ فعل صرف صورۃً گناہ نظر آتا ہے ورنہ درحقیقت یہ سرے سے کوئی گناہ ہے ہی نہیں اگرچہ یہی ظاہری شکل و صورت کے لحاظ سے گناہ معلوم ہوتا ہے لیکن گناہ کی حقیقت اور معنویت کا اس میں کوئی نام و نشان نہیں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ حضرات اس فعل کو لفظ زلت سے تعبیر کرتے ہیں تاکہ اس کے حقیقی گناہ نہ ہونے کی طرف اشارہ قائم رہے چنانچہ اسی مسئلہ کے ذیل میں شمس الائمہ سرخسی زلت کی وضاحت فرماتے ہیں۔

واما الزلة فلا يوجد فيها	زلت میں خاص اسی کا قصد نہیں پایا جاتا
القصد الى عينها ولكن يوجد	اگرچہ اصل فعل کا قصد ہوتا ہے کیونکہ لفظ
القصد الى اصل الفعل لانها	زلت اہل عرب کے اس محاورے سے ماخوذ ہے
اخذت من قولهم زلت	کہ آدمی کیچڑ میں پھسل گیا جب گرنے کا
الرجل في الطين اذا لم	یا اس میں گر پڑنے کا کوئی قصد
يوجد القصد الى الوقوع	نہیں ہوتا اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ

ثم كلهم من الحنفية والشافعية جوزوا الزلة فيها اى الكبائر والصغائر بعد النبوة ومثلوها بان يقصد المباح فيلزم معصية كوكزة موسى عليه السلام القبطي (فواتح الرحموت باختصار ص ۲۳)

وزلة الانبياء عند اهل الحق هو
لكن وجد القصد الى الشئ
في الطريق وانما تؤخذ عليها
لانها لا تخلوا عن نوع تقصير
يمكن للمكلف الاحتراز عنه
عند التثبت واما المعصية الحقيقية
فهي فعل حرام بقصد الى نفسه
مع العلم بحرمته (توضیح ص ۲۰۲)

کے راستہ پر پہنچنے کا قصد ضرور ہوتا ہے
مگر زلہ پر مواخذہ ہوتا ہے اس لئے کہ
یہ بھی کوتاہی سے خالی نہیں ہے کہ مکلف
ہوشیاری کے ذریعہ جس سے بچ سکتا تھا
بہرحال جہاں تک حقیقی معصیت کا تعلق ہے
تو یہ فعل حرام کو اس کے جرم ہونے کا علم
رکھنے کے باوجود بالارادہ کرنے
کا نام ہے۔

اس عبارت سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اس فعل کو حقیقی گناہ کے معنی میں یہ لوگ بھی تسلیم کرنے کے لئے کسی طرح آمادہ نہیں ہیں۔

گناہ کی دو قسمیں ہیں

اس جگہ یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہئے کہ گناہ کی ایک قسم تو وہ ہے کہ جس پر اس کے اثرات اور نتائج کا ترتب ہوتا ہے جسکو حقیقی گناہ کہنا چاہئے اس گناہ سے قبل نبوت یا بعد نبوت انبیاء کرام کے معصوم ہونے میں قائلین جواز کو بھی کوئی اختلاف نہیں ہے البتہ وہ امور جو اپنی صورت اور ظاہر کے لحاظ سے گناہ نظر آتے ہیں اگرچہ گناہ کے آثار و نتائج کا ان پر ترتب نہیں ہوتا۔ اس ظاہری

كما قال الله تعالى وما كان لمؤمن أن يقتل مؤمنا إلا خطأً۔

(فوائد از محمود صفحہ ۲۹)

در مباح ہے جیسا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کسی مومن کے لئے۔ (یہ) جائز نہیں کہ وہ صاحب ایمان کو قتل کر ڈالے الا یہ کہ یہ فعل خطا سے ہو جائے۔

درحقیقت یہ اختلاف لفظی ہے

مذکورہ وضاحتوں کے سامنے آجانے کے بعد یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ان دونوں بزرگوں کے درمیان کوئی حقیقی اختلاف نہیں ہے بلکہ صرف تعبیر کا اختلاف ہے کیونکہ جو لوگ سہواً کبائر کا صدور جائز نہیں مانتے وہ حقیقی گناہ ان کو تصور نہیں کرتے ہیں اس لئے گناہ سے ان کی تعبیر وہ پسند نہیں کرتے اور ان کی نفی کرتے ہیں لیکن جو لوگ اس تعبیر کو روا رکھتے ہیں وہ اس کے حقیقی گناہ ہونے کی نفی کرتے ہیں۔ اور ایسے امور کے حقیقی گناہ نہ ہونے پر ان کے نزدیک کچھ دلائل بھی ہیں۔ مثلاً علامہ عبد العلی کی آخری عبارت میں ایک دلیل کی طرف اشارہ موجود ہے چنانچہ انہوں نے آیت وما کان لمؤمن ان یقتل مومنا الا خطأً[1] سے اپنے موقف پر استدلال کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر فعل قتل خطأً

۱؎ ایسے ہی فرمایا گیا ولیس علیکم جناح فیما اخطأتم به (الاحزاب) جو کام تم نے غلطی سے کر لئے ہیں ان میں تم پر کوئی گناہ نہیں ہے ۱۲

واقع ہو جائے تو اس کا شمار اللہ تعالیٰ کے ارشاد کی اس روشنی میں حقیقی گناہ کے ذیل میں نہیں ہوگا اس کی مزید وضاحت کے لئے اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ ایک شخص بالقصد والارادہ تو ایک مباح اور جائز کام کرنا چاہتا ہے لیکن وہ ہو گیا حرام اور ناجائز اس میں اس شخص کا کیا قصور ہے کہ اس سے مواخذہ کیا جائے مثلاً کسی نے دور سے ایک شکار پر تیر چلایا لیکن شکار تو سامنے سے ہٹ گیا اچانک ایک آدمی نشانہ پر آ گیا اور تیر اس کو لگ گیا ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اس شخص کا کیا قصور ہے اس نے تو شکار پر تیر پھینکا تھا جو ایک جائز اور مباح کام ہے لیکن تیر لگ گیا انسان کو جو اگرچہ جائز نہیں ہے مگر تیر چلانے والا بے قصور ہے کیونکہ اس کا ارادہ یہ نہیں تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یہی صورت پیش آئی تھی کہ ظالم شخص کو ظلم سے روکنے اور ایک مظلوم کی مدد کرنے کے لئے جو بالکل جائز اور مباح امر تھا انھوں نے اس شخص کو ایک گھونسہ مارا لیکن بدقسمتی سے وہ مر ہی گیا ظاہر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا ارادہ جان مارنے کا نہیں تھا یہی وجہ ہے کہ قرآن میں اس فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے واقعہ کی تعبیر کی گئی چنانچہ یہ نہیں ارشاد فرمایا گیا کہ "قتلہ موسیٰ" کہ موسیٰ علیہ السلام نے اس کو مار ڈالا یا "ذبحہ موسیٰ" کہ موسیٰ علیہ السلام نے اس کو قتل کر ڈالا یا "اماتہ موسیٰ" فرمایا کہ موسیٰ نے اس کو اس قدر مارا کہ مر گیا۔ چونکہ موسیٰ علیہ السلام کا ارادہ تو صرف تنبیہ اور ظلم سے روکنے کا تھا اس لئے

صرف ایک گھونسہ مارا مگر اتفاق سے اس کی موت اتنے ہی میں ہو گئی۔ اس فرق
کو واضح کرتے ہوئے دہلوی کی تعبیر ان الفاظ میں کی ہے۔

فوکزہ موسیٰ فقضی — موسیٰ نے اس کو صرف ایک ہی گھونسہ مارا
علیہ ۔ — لیکن اسکا اتنے ہی میں کام تمام ہو گیا۔

یہی وہ باریک نکتہ تھا جسکو فرعون نہیں سمجھ سکا۔ جب اس نے موسیٰ علیہ السلام پر اس قتل کا جرم عائد کیا تو انھوں نے اس کج فہمی کو محسوس کرتے ہوئے یا اصل کام جو اس وقت تبلیغ و رسالت کا تھا جس کے لئے اس وقت دربار فرعون میں تشریف لے گئے تھے اس موضوع سے مسئلہ گفتگو کے ہٹ جانے کا اندیشہ تھا اس لئے بات مختصر کر لی اور فرمایا جس وقت مجھ سے یہ فعل ہوا تھا میں رسول نہیں تھا یا یوں کہیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس وقت بھی اس نکتہ کی طرف فرعون کو متوجہ کیا لیکن ان کی بات کو اقرار جرم پر محمول کر کے مردود حضرت موسیٰؑ کے ذمہ الزام لگاتا ہی رہا کیونکہ حضرت موسیٰؑ کے اس ارشاد کا مطلب مفسرین نے یہی تحریر فرمایا ہے۔

وقال فعلتہا اذاً وانا من — حضرت موسیٰؑ نے فرمایا کہ میں نے کیا تھا وہ
الضالین ای الجاہلین بانہا — لیکن میں اس وقت اس سے بے خبر تھا کہ
تبلغ القتل (تفسیر مدارک جلد ۳) — یہ مار موت تک پہنچ جائے گا۔

یعنی گھونسہ چلانے کا مقصد جان سے مارنا نہیں تھا بلکہ محض دفع ظلم کیلئے

مجھے کیا خبر تھی کہ ایک ہی گھونسے میں مر جائے گا لہٰذا قتل کر دینے کا ارادہ
نہیں تھا اس لئے یہ الزام درست نہیں اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے
متعلق بخاری و مسلم کی یہ روایت جو مشکوٰۃ صفحہ ۵۰۰ پر ہے کہ

لم یکذب ابراہیم الا ثلث کذبات — حضرت ابراہیم نے تین مواقع کے علاوہ کبھی کذب کا صدور نہیں ہوا۔

اس کی شرح میں ملا علی قاریؒ تحریر فرماتے ہیں۔

ای تسمیتھا کذبات صورتہا صورۃ الکذب سمیت کذبات.. والا فی نفس الامر لیست کذبات (مرقات شرح مشکوٰۃ) — چونکہ اس کی ظاہری صورت کذب کی تھی اس لئے لفظ کذب سے تعبیر کر دیا گیا ورنہ حقیقتاً یہ کذب نہیں تھا۔

اس عبارت سے بھی روز روشن کی طرح واضح ہو گیا ہے کہ گناہ کی دو قسم
صورۃً اور حقیقۃً کرنا صحیح ہے اور جن محققین نے قبل نبوت یا بعد نبوت اس
کا صدور تسلیم کیا ہے وہ اسی تقسیم کے قائل ہیں سہواً کبیرہ کے سلسلہ میں
ان وضاحتوں کے سامنے آجانے کے بعد یہ چیز از خود واضح ہو جاتی ہے
کہ اس اختلاف میں کوئی جوہری اور معنوی فرق نہیں ہے کیونکہ جو لوگ
سہواً کبیرہ کا صدور بھی صرف صورۃً گناہ مانتے ہیں حقیقتاً گناہ نہیں کہتے
ان کے نزدیک یہ عصمت کے بھی منافی نہیں ہے اس لئے کہ عصمت تو حقیقی
گناہ سے روکنے والی صفت کو کہتے ہیں اور جو لوگ اس کو حقیقی گناہ

سمجھتے ہیں وہ اس کا صدور ہی نہیں مانتے لہٰذا اختلاف صرف لفظی ہوجاتا ہے یہی وجہ ہے کہ جو لوگ قبل نبوت یا بعد نبوت کبیرہ گناہوں کا صدور جائز مانتے ہیں وہ بھی اس بات کی تصریح فرماتے ہیں کہ جو گناہ صغیرہ ہیں اگر وہ خست و دنائت اور رذالت طبع پر دلالت کرتے ہیں تو ان کا صدور بہرحال قبل نبوت بھی ممکن درست نہیں ہے گویا عیب اور نفرت کا باعث جو امر ہے وہ سب کے نزدیک بالاتفاق گناہ اور قابل نفرت ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے۔

واما الصغائر المنفرۃ کسرقۃ لقمۃ او حبۃ وتسمی صغائر الخستۃ فہم معصومون منہا مطلقا وکذا من غیر المنفرۃ کنظرۃ اجنبیۃ عمدا۔

(رسالہ موہبہ صفحہ ۹۷)

جہاں تک قابل نفرت صغائر کا معاملہ ہے جیسے ایک دانہ یا ایک لقمہ کی چوری کرنا اس کو صغائر خسیسہ بھی کہتے ہیں تو انبیا علیہم السلام علی الاطلاق (یعنی عمداً و سہواً) معصوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح صغائر نا قابل نفرت سے بھی بشرطیکہ قصداً ہو معصوم ہوتے ہیں جیسے کسی اجنبی عورت پر نگاہ ڈالنا۔

علامہ تفتازانی فرماتے ہیں۔

والحق منع ما یوجب النفرۃ کعہر الامہات والفجور

اور حق بات یہ ہے کہ جو قابل نفرت گناہ ہیں جیسے ماں کے ساتھ زنا کرنا یا بے حیائی کے کام

و لا تصغائر الا على الخطأ (شرح عقائد صفحہ ۱۱۲)

اور نہیں قسم کے صغائر یہ سب ہاور نہیں ہو سکتے۔

بعد نبوت بھی عصمت میں یہی تفصیل ہے۔ مشہور درسی کتاب مالابد منہ میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی تحریر فرماتے ہیں

انبیاء معصوم اند از صغائر و کبائر (مالابد منہ صفحہ ۹۶)

تمام انبیاء علیہم السلام کبائر و صغائر سے معصوم ہیں

اسی جگہ مالابد منہ کے فارسی حاشیہ میں یہ تفصیل موجود ہے۔

مذہب جمہور آنست کہ انبیاء در زمان نبوت معصوم اند از صغائر عمداً و سہواً و خطأً و از کبائر عمداً۔ کذا فی شرح المواقف للسید جرجانی و شرح العقائد للتفتازانی و در شرح قصیدہ امالی مذکور است صدور کبیرہ و صغیرہ عمداً قبل وحی و بعد آں از انبیاء ممتنع و اما صدور صغیرہ سہواً و خطأً قبل از نبوت جائز است و بعد آں۔ (حاشیہ مالابد منہ صفحہ ۹۶)

جمہور اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام نبوت کے زمانہ میں عمداً سہواً اور خطأً کبائر سے معصوم ہوتے ہیں جیسا کہ علامہ جرجانی کی شرح مواقف اور علامہ تفتازانی کی شرح عقائد میں ہے اور شرح قصیدہ امالی میں لکھا ہے کہ صغیرہ و کبیرہ کا عمداً وقوع وحی کے پہلے یا وحی کے بعد جائز نہیں ہے لیکن شاذ و نادر طریقہ پر سہواً صغیرہ کا وقوع قبل نبوت اور بعد نبوت بھی جائز ہے۔

خلاصہ یہ کہ اب تک کی جو تفصیلیں کبائر عمداً اور سہواً یا صغائر وغیرہ کے متعلق آچکی ہیں ان کے اندر قبل نبوت اور بعد نبوت دونوں حالتوں میں حکم ایک ہی ہے البتہ صغائر کے متعلق اختلاف ہے لیکن حق یہی ہے کہ عمداً صغائر سے قبل نبوت اور بعد نبوت دونوں حالتوں میں معصوم ہوتے ہیں اور سہواً کے متعلق وہی اختلاف نقل یہاں بھی موجود ہے جس کی وجہ سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ حاصل بحث یہ نکلی کہ انبیاء کرام ہر حالت میں بچائے گئے ہیں گناہوں سے معصوم ہیں قبل نبوت بھی بعد نبوت بھی دونوں حالتوں میں

حق یہی ہے کہ انبیاء ابتدا ہی سے معصوم ہیں

اب تک جو حوالے سامنے آگئے ہیں ان سے یہ بات واضح طریقہ پر سمجھ میں آچکی ہوگی کہ انبیاء کرام علیہم السلام کا زمانۂ نبوت کے پہلے بھی معصوم ہونا ایک مسلّم حقیقت ہے لیکن یہ بات اب تک صاف نہ ہو سکی کہ زمانۂ نبوت کے پہلے عصمت کے ثبوت کے لئے کوئی مقررہ اور متعین وقت بھی ہے یا نہیں اگر ہے تو اہلسنت والجماعت کے نزدیک وہ کون سا وقت ہے جس سے عصمت کی ابتدا تسلیم کی جائے تو اس سلسلہ میں لوگوں کے خیالات مختلف ہیں۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر کبیر میں تحریر فرماتے ہیں۔

اختلف الناس فی وقت العصمۃ علی ثلثۃ اقوال (احدھا) قول من ذھب الی انھم

عصمت کے وقت کے متعلق لوگوں کا اختلاف ہے اور اس میں تین اقوال ہیں اول ان لوگوں کا قول ہے جو اس طرف گئے ہیں کہ

معصومون من وقت مولدهم
وهو قول الرافضة وثانيها قول من
ذهب الى وقت عصمتهم وقت
بلوغهم ولم يجوزوا منهم
ارتكاب الكفر والكبيرة قبل النبوة
وهو قول كثير من المعتزلة وثالثها
قول من ذهب الى ان ذلك
لا يجوز وقت النبوة واما قبل النبوة
فجائز وهو قول اكثر اصحابنا و
قول ابي الهذيل وابي علي من
المعتزلة (تفسیر کبیر ص ج ۳)

انبیاء معصوم ہوتے ہیں اپنی ولادت کے وقت
ہی سے یہ خیال شیعوں کا ہے دوم یہ ان لوگوں کا
قول ہے جو اس بات کی طرف گئے ہیں کہ بلوغ
کے وقت سے ہی عصمت ہوتی ہے ان لوگوں نے
قبل نبوت کفر اور کبیرہ کے وقوع کو ناجائز
مانا ہے اکثر معتزلہ کا یہی قول ہے۔ سوم یہ ان
حضرات کا قول ہے جو کہتے ہیں کہ انبیاء سے
یہ چیزیں نبوت کے وقت سے نا جائز ہوتی
ہیں لیکن نبوت سے قبل جائز ہیں یہ قول ہمارے
اکثر اصحاب کا ہے اور یہی رائے ابو ہذیل
اور ابو علی جبائی معتزلی کا ہے۔

اس جگہ امام رازی نے مسئلہ سے متعلق جو تین اقوال تحریر کئے ہیں ان
میں سے بعض امور غور طلب ہیں کیونکہ انھوں نے تیسرے قول کو اپنے اصحاب
کی اکثریت کا قول قرار دیا ہے جس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ اہلسنت
والجماعت کا قول مختار یہی ہے حالانکہ یہ بات کسی طرح درست نہیں ہے اس
لئے کہ اکابر محققین اور علماء اہلسنت والجماعت کی بے شمار تصریحات اس
کے خلاف موجود ہیں جن میں اکثر اصحاب کے اس قول کے خلاف دوسرے

قول کو اصح الاقوال اور مذہب مختار بتایا گیا ہے اسی طرح قول اول کو اس جگہ امام رازی نے صرف شیعہ حضرات کا قول قرار دیا ہے حالانکہ یہ بات بھی درست نہیں ہے کیونکہ مسلمانان کا یہ قول ہرگز نہیں ہے بلکہ علما محققین کے نزدیک اہلسنت والجماعت کا مسلک مختار یہی ہے جیسا کہ آئندہ اس سلسلہ کے متعدد حوالوں سے یہ بات روشن ہو جائے گی۔ رہی یہ چیز کہ جو مذہب شیعوں کا ہے اہلسنت اسے کیونکر اختیار کر سکتے ہیں تو اس سوال کو بھی علما نے اپنی جگہ حل کر دیا ہے چنانچہ شرح عقائد نسفی کی مشہور و متداول شرح نبراس میں ہے۔

ان قلت فهذه العصمة مذهب الشيعة قلت لو كان كذلك لا باس في الاتفاق اذ المقصود الشائع اتباع الحق وفاق وثانياً ان بين الفريقين بعد المشرقين لان الشيعة على تجويز الكفر تقية۔

(نبراس صفحہ [illegible])

اگر تم یہ اعتراض کرو کہ یہ عصمت تو شیعہ مذہب ہے میں جواب دوں گا کہ کسی امر حق میں متفق ہو جانے سے کوئی حرج واقع نہیں ہوتا اس لئے کہ ہمارا مقصود تو اتباع حق ہے شیعوں کی موافقت مقصود نہیں ہے دوسری بات یہ بھی ہے کہ ہمارے اور شیعہ کے مذہب میں مشرق و مغرب کا فرق ہے اس لئے کہ وہ بطور تقیہ کفر کے ادا کرنا جائز قرار دیتے ہیں[1]۔

---

[1] یجوزون علیہم الکفر تقیۃ عقلاً وشرعاً قبل النبوۃ وبعدها (فواتح الرحموت صفحہ [illegible])

غرض یہ ہے کہ اس سلسلہ میں محققین اہلسنت والجماعت نے جو کچھ لکھا ہے ان سب کا حاصل یہی ہے کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا وقت ولادت ہی سے معصوم ہونا مسلک حق ہے۔ نبوت کے بعد خود امام رازیؒ کے نزدیک بھی معصوم ہونا ہی مذہب مختار ہے چنانچہ تحریر فرماتے ہیں۔

والمختار عندنا انه لم يصدر عنهم الذنب حال النبوة البتة لا الكبيرة ولا الصغيرة (تفسیر کبیر ج ۳)	ہم اہل سنت کے نزدیک مختار یہ ہے کہ انبیاء کرام سے بحالت نبوت کوئی گناہ نہیں ہوتا نہ صغیرہ اور نہ کبیرہ[1]

قبل نبوت معصوم ہونے کے سلسلہ میں حاشیہ ملا جزینہ کے حوالہ سے اہلسنت کا موقف گذشتہ صفحات میں نقل کیا جا چکا ہے مزید حوالے درج کئے جاتے ہیں حاشیہ نبراس میں ہے۔

والمختار عندنا انه لم يصدر عنهم الذنب حال النبوة واما قبلها فلا تقع الكبيرة لا نفسا عمداً وفي صدور الصغائر اختلاف و لا شك هذا	ہم اہلسنت کا مذہب مختار یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے بحالت نبوت کسی طرح کا گناہ نہیں ہوتا اور نبوت سے پہلے کبیرہ گناہ عمداً نہیں ہوتا اور صغیرہ گناہ کے قبل نبوت صدور میں اختلاف ہے اور ان مسائل سے متعلق ان

[1] عصمت انبیاء پر امام رازی نے عقل و نقل سے ۱۵ دلیلیں قائم فرمائی ہیں۔ دیکھئے تفسیر کبیر صفحہ ۳۲۰، ۳۲۱ / ۱۲۰

صفحہ کو دیکھو فی المطولات (حاشیہ بر ص) بڑی بڑی کتابوں میں موجود ہیں۔

مولانا صدیق حسن خاں صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

ذهب الاشاعرة الى ان الانبياء معصومون عن الكبائر مطلقا اى عمدا وسهوا وعن الصغائر عمدا لكن اصح فى شرح المواقف (الانتقاد الرجيح صفحہ ۴۹)

اشاعرہ اس طرف گئے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کبیرہ گناہوں سے علی الاطلاق یعنی عمداً اور سہواً دونوں سے اور صغیرہ گناہوں سے عمداً معصوم ہوتے ہیں۔ شرح مواقف میں اسی طرح ہے۔

علامہ محمد ابن عبد المحسن اپنی کتاب «الروضۃ البہیۃ» میں رقمطراز ہیں۔

والامام ابو حنيفة ذكر فى الفقه الاكبر ان الانبياء عليهم الصلوة والسلام معصومون عن الصغائر والكبائر جميعا وهو الحق وقيده بعض الحنفية بعد الوحى فتجوز الصغيرة على سبيل الندرة ثم يعود حالهم وقت الارسال الى الصلاح والسداد

حضرت امام ابو حنیفہ علیہ الرحمہ نے فقہ اکبر میں ذکر کیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کبائر اور صغائر سب سے معصوم ہوتے ہیں اور یہ بالکل حق ہے مگر بعض حنفیوں نے اس کو وحی کے بعد کے ساتھ مقید کیا ہے لہٰذا ان کے نزدیک صغیرہ شاذ و نادر قبل نبوت صادر ہو سکتا ہے اور پھر نبوت ملنے کے وقت تک ان کی حالت بہتری اور درستگی کی طرف رجحان (سے علاوہ صغیرہ کا صدور بھی ناجائز ہو جاتا ہے)

وکبائر سے معصوم ہوتے ہیں۔ محدث کبیر علامہ ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

اذ الانبیاء معصومون قبل النبوۃ وبعدھا عن کبائر الذنوب وصغائرھا ولو سہواً علیٰ ما ھو الحق عند المحققین وان کان الاکثرون علیٰ خلافہ (مرقاۃ ص ۱۹)

کیونکہ انبیاء کرام قبل نبوت اور بعد نبوت چھوٹے اور بڑے گناہوں سے اگرچہ سہواً ہی ہو بالکل معصوم ہوتے ہیں اس مذہب کے مطابق جو محققین کے نزدیک حق ہے چاہے اکثر لوگ اس کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔

ملا علی قاری نے ابن حجر کے اس قول پر اعتراض کرتے ہوئے اپنی رائے اس طرح ظاہر کی ہے۔

ثم الصحیح قول الجمہور وھو بعدم صدور شیء من الکبائر من الانبیاء سہواً والصغائر عمداً بعد الوحی واما قبل الوحی فلا دلیل علیٰ امتناع صدور الکبیرۃ وذھب المعتزلۃ الی امتناعھا ومنعت الشیعۃ صدور الصغیرۃ والکبیرۃ قبل الوحی وبعدہ (موضوعات ص ۱۲۰)

قول صحیح جمہور ہی کا قول ہے یعنی یہ کہ انبیاء کرام سے بعد نبوت کے بھی سہواً کبائر کا وقوع ممتنع ہے الا صغائر کا عمداً اور نبوت سے پہلے کبائر کے عدم صدور پر کوئی دلیل نہیں ہے معتزلہ عدم صدور کے قائل ہیں اور شیعہ نے قبل نبوت اور بعد نبوت دونوں حالتوں میں صغائر اور کبائر کے وقوع کی نفی کی ہے

اس جگہ ملا علی قاری علیہ الرحمۃ نے اگرچہ محققین کے قول مختار سے بظاہر
اختلاف کیا ہے اور اکثریت اور جمہور کی رائے کی تصحیح کی ہے لیکن ناظرین کو
یاد ہوگا کہ گذشتہ صفحات میں یہ بات ملا علی قاریؒ کے حوالے سے ہی بیان
کی جا چکی ہے کہ محققین کے اس اجماعی خیال اور اکثریت کی رائے کے درمیان
کوئی حقیقی اختلاف نہیں ہے بلکہ دونوں قول کے درمیان تطبیق اور موافقت
کی صورت ممکن ہے جیسا کہ ملا علی قاریؒ کی بیان کردہ تطبیق ناظرین کے سامنے
آ چکی ہے جس سے یہ بات بآسانی سمجھی جا سکتی ہے کہ اس جگہ ملا علی قاریؒ نے
محققین کی رائے سے محض لفظی اختلاف کیا ہے ورنہ وہ بھی محققین کے قول
کی طرف ہی رجوع کر چکے ہیں جیسا کہ مرقاۃ کے حوالے سے ان کی بیان کردہ
تطبیق کے ذیل میں یہ بات گذر چکی ہے اس کے علاوہ پوری صراحت کے ساتھ
ملا علی قاری کا رجوع محققین کے قول کی طرف ثابت ہے اس لئے کہ انھوں
نے خود بھی شرح فقہ اکبر میں محققین کے ہی مسلک کو اصح اور مختار تحریر فرمایا
ہے ان کے الفاظ یہ ہیں۔

ثم هذه العصمة ثابتة للانبياء قبل النبوة وبعدها على الاصح (شرح فقہ اکبر ص۵۲)

پھر یہ کبائر و صغائر سے عصمت ثابت ہے انبیاء علیہم السلام کے لئے قول اصح کی بنیاد پر نبوت کے قبل بھی اور نبوت کے بعد بھی

صغیرہ گناہوں کے سلسلے میں بھی صحیح عدم جواز ہی ہے جیسا کہ ارباب

تحقیق اکابر علماء اہلسنت بالخصوص احناف نے اس کی تصریح کی ہے فرماتے ہیں۔

وجاز تعمد غیرها ای غیر الکبائر عمدا انصفا الحنفیة بلا اصرار فان الاصرار علی الصغیرة کبیرة عند اکثر الشافعیة والمعتزلة ومنعه الحنفیة اقول وهو الحق (مسلم الثبوت مع شرحه ص۲۳۰)

صغائر خسیسہ یا گناہان دونوں کو چھوڑ کر یعنی کبائر و صغیرہ بلا اصرار قصداً اکثر شافعیہ اور معتزلہ کے نزدیک جائز ہے کیونکہ صغیرہ اصرار سے ان کے نزدیک کبیرہ ہو جاتا ہے لیکن احناف قصداً صغائر کی نفی کرتے ہیں اور میں کہتا ہوں کہ حق بھی یہی ہے۔

اس عبارت سے یہ حقیقت بے غبار ہو گئی کہ صغائر سے معصوم ہونا بھی حنفیہ کے نزدیک حق اور مختار ہے اسی طرح کبائر قبل نبوت کے سلسلہ میں بھی علاوہ ان امور کے جو انبیاء کرام کیلئے مخصوص ہیں۔ شریعت کا عام قاعدہ معلوم و مسلم ہے کہ زمانۂ بلوغ سے پہلے ہر شخص معصوم ہوتا ہے۔ بنا بریں کم از کم قبل بلوغ انبیاء علیہم السلام کا غیر معصوم ہونا بالکل لغو اور بے معنی ہے۔ پس عام اصول کا تقاضہ بھی ہے کہ وہ زمانۂ بلوغ کے پہلے معصوم ہوں۔ باقی زمانۂ بلوغ کے بعد اور زمانۂ نبوت کے قبل کے درمیانی وقفہ ہے اس میں عصمت کا سلب ہو جانا نہ ثابت ہے اور نہ امر معقول ہے کیونکہ بلوغ سے پہلے کی حاصل شدہ عصمت کا باقی رہنا بطریق معقول و مناسب ہے۔ بالخصوص حالت سابقہ

کے منافی جبکہ کوئی نئی بات لاحق و حادث نہیں ہوتی بلکہ اس کے برخلاف جو نئے امور حادث ہوتے ہیں وہ بقائے عصمت ہی کے متقاضی ہیں بنا بریں اس درمیانی وقفے میں عصمت کا حاصل ہونا ہی قرین قیاس ہے بلکہ قرائن وشواہد بھی اسی کی تائید کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے لئے محققین اہلسنت والجماعت نے ولادت کے وقت سے ہی عصمت کا حاصل ہونا درست تسلیم کیا ہے چنانچہ علامہ عبد العلی بحر العلوم ارشاد فرماتے ہیں۔

هذا تمام الكلام في ما بعد النبوة و ما قبل فالتحقيق و عليه اهل الله من الصوفية الكرام انهم معصومون ايضا من الكبائر والصغائر عمدا كيف لا وهم انما يولدون على الولاية وتربيتهم على طريقة عالية وهم منور مشاهدون لله تعالى وولايتهم قوية من ولاية الاولياء الذين ولايتهم ماخوذة من وراثتهم

یہ ساری گفتگو بعد نبوت سے متعلق تھی جہاں تک قبل نبوت کا معاملہ ہے تو تحقیقی بات یہ ہے اور صوفیائے کرام میں سے اہل اللہ بھی اسی پر ہیں کہ انبیاء کرام تمام صغائر و کبائر سے عمداً معصوم ہوتے ہیں اور کیوں نہ ہوں جب کہ ان کی ولادت ہی ولایت پر ہوتی ہے نہ کوئی گناہ کیا گزرتا ہی نہیں جیسی حیثیت ہوتی ہے کرتے ہوں بلکہ ان کی ولایت تو اولیاء کرام کی ولایت سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے کیونکہ اولیاء کرام کی تو انہیں کی ولایت ماخوذ ہے ان اولیاء

والانبیاء معصومون عن المعاصی — معاصی سے محفوظ ہونے پر بلکہ ذنوب کبیرہ اور

فانہم ... ثابت علیہ زوائغ اور فواحش — اسی پر منقول ہے ... ہو۔

ایک انصاف پسند اور جویائے حق کے لئے اتنے ٹھوس حوالوں کے سامنے آجانے کے بعد عصمتِ انبیاء کے مسئلے میں کسی شبہ کے باقی رہ جانے کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی ہے البتہ جن طبیعتوں نے قبولِ حق کی فطری صلاحیت کو ہی حسد و تعصب اور ہٹ دھرمی و بے شرمی کی بھینٹ چڑھا دیا ہے ان سے اور حق قبول کرنے کی کوئی توقع رکھنا فضول ہے بلکہ ان کے لئے یہ ساری قوت لگانا بے سود و بیکار ثابت ہوں گی۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر — مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

بہرحال ناظرین نے محسوس کیا ہوگا کہ مولانا مودودی نے زمانۂ نبوت سے پہلے عصمت کا کلی طور پر انکار کر کے بلکہ زمانۂ نبوت سے قبل انبیاء کرام علیہم السلام کے لئے ہر طرح کا صغیرہ و کبیرہ روا رکھ کر کتنی خطرناک گمراہی کا دروازہ کھول دیا ہے انھوں نے تمام اہلسنت کے مسلک کو چھوڑ کر ایک باطل نظریہ کو رواج دینے کی کوشش کی ہے۔

مولانا مودودی انبیاء کرام سے قبلِ نبوت کفر کا وقوع بھی جائز مانتے ہیں	مولانا مودودی نے انبیاء کرام کے لئے قبلِ نبوت عصمت کے اجماعی مسئلے

بھی انکار نہیں کیا ہے بلکہ نبوت و رسالت کے پہلے ان سے ہر طرح کے
گناہ حتیٰ کہ کفر و شرک کے وقوع پذیر ہونے کا عقیدہ بنایا ہے جس کا
باتفاق امت غلط اور باطل ہونا واضح ہوچکا ہے بلکہ یوں کہیے کہ بار بار
کی یاددہانی اور توجہ دلانے کے باوجود مولانا مودودی نے انبیاء علیہم السلام
کے لیے زمانۂ نبوت سے پہلے کفر و شرک کے واقع ہوجانے پر اصرار کیا ہے حالانکہ
یہ عقیدہ سراسر کفر اور انتہائی خطرناک ہے جن باطل فرقوں نے اس عقیدہ
کو اپنایا ہے ان کے متعلق علامہ عبدالعلی بحرالعلوم ارشاد فرماتے ہیں۔

والحق انہم بمثل ہذہ الاقاویل
خرجوا عن ربقۃ الاسلام وھذا لانہم
بغضوا انبیاء اللہ صلوات اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین
حتی صوروا خنزیر رخوا بہ وہم صفتہ

سچی بات یہ ہے کہ یہ (شیعہ) حضرات
شرک کے قول کی وجہ سے دائرۂ اسلام سے
خارج ہوچکے ہیں یہی وجہ ہے کہ بعض اولیاء
اللہ علیہم الرحمۃ نے ان کو سور کی شکل میں دیکھا

رسائل و مسائل کے حوالے سے گزر چکا ہے کہ مولانا مودودی کے نزدیک
حضرت آدمؑ نے گناہ کبیرہ کیا ہے اور یہ بھی گزر چکا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام
نے قبل نبوت ان کے خیال میں ایک بہت بڑے گناہ یعنی گناہ کبیرہ کا ارتکاب
کیا تھا جس کا بعد میں فرعون کے سامنے اقرار بھی کرلیا ہے اب یہ بھی پڑھئے کہ
مولانا مودودی کے نزدیک انبیاء علیہم السلام قبل نبوت کفر و شرک میں بھی
مبتلا ہوتے ہیں بالخصوص حضرت ابراہیم علیہ السلام تو قبل نبوت مولانا مودودی

کے نزدیک ضرور شرک میں مبتلا رہ چکے تھے۔

سنِ رشد تک حضرت ابراہیم علیہ السلام مودودی صاحب کے خیال میں مبتلائے شرک تھے	مودودی صاحب کو ان کی اس خطرناک غلطی کی طرف متوجہ کرنے کے لئے

کسی نے سوال کیا۔

سوال:۔ آپ نے تفہیم القرآن میں سورۂ انعام رکوع ۹ سے متعلق ایک توضیحی نوٹ میں لکھا ہے کہ وہ حضرت ابراہیمؑ "ہذا ربی" کہنے سے شرک کے مرتکب نہیں ہوئے کیونکہ ایک طالب حق اپنی جستجو کی راہ میں سفر کرتے ہوئے بیچ کی جن منزلوں پر غور و فکر کرنے کے لئے ٹھہرتا ہے اصل اعتبار اس کا نہیں بلکہ اس سمت کا ہوتا ہے جس پر وہ پیش قدمی کر رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر نبوت وہبی ہوتی ہے تو حضرت ابراہیمؑ کو عام انسانوں کی طرح خدا کے ماننے یا نہ ہونے کے مسئلے میں شک اور تحقیق کی ضرورت نہ ہوتی اگر انھوں نے عام انسانوں کی طرح دماغی کاوشوں اور منطق و فلسفہ ہی سے اللہ کی الوہیت کو پایا تو نبوت[1] ایک کسبی معاملہ ہوا اور ایک فلاسفر اور نبیؑ کے حصولِ علم میں کوئی فرق نہ ہوا۔

مولانا مودودی صاحب اس کا جواب دیتے ہیں۔

---

[1] سائل کو نبوت کی جگہ عقیدۂ توحید لکھنا چاہیئے تھا۔

جواب: معلوم ہوتا ہے کہ نبوت کے وہبی ہونے کا مطلب نہیں سمجھا گیا اسی وجہ سے یہ سوال پیدا ہوا ہے نیز آیات کے مشاہدے سے حق کی جستجو کرنا اور فلسفیانہ قیاس آرائیوں سے حقیقت تک پہونچنے کی کوشش کرنا ایک دوسرے کا ہم معنیٰ سمجھ لیا گیا ہے۔ یہ چیز بھی سائل کے لیے غلط فہمی کی موجب ہوئی۔

قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام وحی آنے سے پہلے جو علم رکھتے تھے اس کی نوعیت عام انسانی علوم سے کچھ بھی مختلف نہ ہوتی تھی ان کے پاس نزول وحی سے پہلے کوئی ایسا ذریعہ علم نہ ہوتا تھا جو دوسرے لوگوں کو حاصل نہ ہو چنانچہ فرمایا ما کنت تدری ما الکتب ولا الایمان (شوریٰ ۵۲) تم کچھ نہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے ووجدک ضالا فہدی (والضحیٰ) اور اس نے تم کو ناواقف راہ پایا پھر راستہ بتایا اس کے ساتھ قرآن ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام نبوت سے پہلے علم و معرفت کے انہیں عام ذرائع سے جو دوسرے انسانوں کو حاصل ہے ایمان بالغیب کی منزل طے کر چکے ہوتے تھے وحی اگر جو کچھ کرتی تھی وہ بس یہ تھا کہ پہلے جن حقیقتوں پر ان کا دل گواہی دیتا تھا اب انہیں کے متعلق وحی بھیجی اور عقل شہادت دیتی تھی کہ وہ حق ہیں اور انہیں صداقتوں کا عینی مشاہدہ کرا دیا جاتا تھا تاکہ وہ پورے وثوق سے دنیا کے سامنے ان کی گواہی دے سکیں۔ یہ مضمون سورۂ ہود میں بار بار تکرار بیان کیا گیا ہے چنانچہ پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا۔

کر دہی کے ذریعہ سے حقیقت کا براہ راست علم پانے سے پہلے انبیاء
علیہم السلام مشاہدہ اور غور و فکر کی فطری قابلیتوں کو صحیح طریقے پر
استعمال کر کے جسے اوپر کی آیات میں بینۃ من ربی سے تعبیر کیا گیا ہے،
توحید و معاد کی حقیقتوں تک پہونچ جاتے تھے اور رسالت کی یہ پہلی وہبی
نہیں بلکہ کسبی ہوتی تھی اس کے بعد پھر اللہ تعالیٰ انہیں علم وحی عطا کرتا تھا اور یہ چیز

دیکھیے [illegible] مشاہدہ اور غور و فکر کی فطری صلاحیتوں کو صحیح طریقہ پر استعمال کر کے انبیاء علیہم السلام توحید
کی حقیقت تک وحی کی آمد سے پہلے پہونچ جاتے تھے اور ان کا یہ علم توحید کا حاصل کرنا عقلی اور استدلالی
ہوتا تھا جو غور و فکر کے کسب کا نتیجہ تھا یہ وہبی نہیں تھا بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ متعلقہ
آیتوں میں سے کسی ایک آیت کے اندر بھی کوئی ایسا کلمہ نہیں ہے جو مودودی صاحب کے اس
مقصود پر دلالت کرتا ہو بلکہ بینۃ کے ساتھ من ربی کا اضافہ ہر جگہ اسی بات کی
صراحت کرتا ہے کہ یہ توحید کا علم ان انبیاء کرام علیہم السلام کو کسب و استدلال
کے بغیر خالصۃً منجانب اللہ ہوتا تھا بلکہ یوں کہیے کہ وہبی کی دوسری تعبیر ہی
من ربی ہے علاوہ بریں بینۃ سے یہ بھی ضروری نہیں کہ لازماً علم توحید ہی
مراد ہو بلکہ دلیل و حجت و برہان وغیرہ بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح بینۃ پر
رحمت کا عطف تفسیری بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ بعض مفسرین
کا خیال ہے ۱۲

کبھی نہیں بلکہ وہی ہوتی تھی (رسائل و مسائل حصہ اول صفحہ ۲۰۱،۲۰۲،۲۲۲)

اس جگہ سائل نے تفہیم القرآن کی جس تفسیر اور توضیحی نوٹ کا حوالہ دیا ہے اس کو ناظرین کے سامنے پیش کر دینا ضروری ہے متعلقہ آیت کی تفسیر میں مولانا مودودی صاحب تفہیم القرآن کے اندر تحریر فرماتے ہیں۔

یہاں حضرت ابراہیمؑ کے اس ابتدائی تفکر کی کیفیت بیان کی گئی ہے جو منصب نبوت پر سرفراز ہونے سے پہلے ان کے لئے حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ بنا اس میں بتایا گیا ہے ایک صحیح الدماغ اور سلیم الفطرت انسان جس نے سراسر شرک کے ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں اور جسے توحید کی تعلیم کہیں سے حاصل نہ ہو سکی تھی کس طرح آثار کائنات کا مشاہدہ کرکے اور ان پر غور و فکر اور ان سے صحیح استدلال کرکے امر حق معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا اوپر قوم ابراہیم کے جو حالات بیان کئے گئے ہیں ان پر ایک نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جب ہوش سنبھالا تھا تو ان کے گرد و پیش ہر طرف چاند سورج اور تاروں کی خداوندی کے ڈنکے بج رہے تھے اس لئے قدرتی طور پر حضرت ابراہیمؑ کی حقیقت کی جستجو کا آغاز اسی سوال سے ہونا چاہئے تھا کہ کیا فی الواقع ان میں سے کوئی رب ہو سکتا ہے اسی مرکزی سوال پر انھوں نے غور و فکر کیا اور آخر کار اپنی قوم کے سارے خداؤں کو ایک اٹل قانون کے تحت غلاموں کی طرح گردش کرتے دیکھ کر

وہ اسی نتیجہ پر پہونچ گئے کہ جن جن کے رب ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے ان میں سے کسی کے اندر بھی الوہیت کا شائبہ تک نہیں ہے رب صرف وہی ایک ہے جس نے ان سب کو پیدا کیا ہے اور بندگی پر مجبور کیا۔

اس قصہ کے الفاظ سے عام طور پر لوگوں کے ذہن میں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے یہ جو ارشاد ہوا کہ جب رات طاری ہوئی تو اس نے ایک تارا دیکھا اور جب وہ ڈوب گیا تو یہ کہا پھر دیکھا چاند کو اور جب وہ ڈوب گیا تو یہ کہا اور پھر دیکھا سورج کو اور جب وہ بھی ڈوب گیا تو یہ کہا اس پر ایک عام ناظر کے ذہن میں فوراً یہ سوال کھٹکتا ہے کہ کیا بچپن سے آنکھ کھولتے ہی روزانہ حضرت ابراہیمؑ پر رات طاری نہ ہوئی تھی اور کیا وہ پہلے چاند، تاروں اور سورج کو طلوع و غروب ہوتے نہ دیکھتے تھے؟ ظاہر بات ہے کہ غور و فکر تو انھوں نے سن رشد کو پہونچنے کے بعد ہی کیا ہوگا۔ پھر یہ قصہ اس طرح کیوں بیان کیا گیا ہے کہ جب رات ہوئی تو یہ دیکھا اور دن نکلا تو یہ دیکھا گویا خاص واقعہ سے پہلے انھیں یہ چیزیں دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا حالانکہ ایسا ہونا صریحاً مستبعد ہے۔

یہ شبہ بعض لوگوں کے لئے اس قدر ناقابل حل بن گیا کہ اسے دفع کرنے کی کوئی صورت انھیں اس کے سوا نظر نہ آئی کہ حضرت ابراہیمؑ کی پیدائش اور پرورش ایک غار میں ہوئی تھی جہاں سن رشد کو پہونچنے تک چاند، تاروں اور سورج کے مشاہدہ سے محروم رکھے گئے تھے۔

حالانکہ یہ بات بالکل صاف ہے اور اس کو سمجھنے کے لئے اس نوعیت کی کسی داستان کی ضرورت نہیں ہے۔ نیوٹن کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے باغ میں ایک سیب کو درخت سے گرتے دیکھا اور اس سے اس کا ذہن اچانک اس سوال کی طرف متوجہ ہو گیا کہ اشیاء آخر زمین ہی پر کیوں گرا کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ غور کرتے کرتے قانون جذب و کشش کے استنباط تک پہونچ گیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس واقعہ سے پہلے نیوٹن نے کبھی کوئی چیز زمین پر گرتے نہیں دیکھی تھی؟ ظاہر ہے کہ ضرور دیکھی ہوگی اور بار بار دیکھی ہوگی پھر کیا وجہ ہے کہ وہ اس تاریخ کو سیب گرنے کے مشاہدے سے نیوٹن کے ذہن میں وہ حرکت پیدا ہوئی جو اس سے پہلے روزمرہ کے ایسے سیکڑوں مشاہدات سے نہ ہوئی تھی۔

اس کا جواب اگر کچھ ہوسکتا ہے تو یہی ہوسکتا ہے کہ غور و فکر کرنے والا ذہن ہمیشہ ایک طرح کے مشاہدات سے ایک ہی طرح متاثر نہیں ہوا کرتا۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک چیز کو ہمیشہ دیکھتا رہتا ہے اور اس کے ذہن پر کوئی حرکت پیدا نہیں ہوتی مگر ایک وقت اسی چیز کو دیکھ کر یکایک ذہن میں ایک کھٹک پیدا ہو جاتی ہے جس سے فکر کی قوتیں ایک خاص مضمون کی طرف کام کرنے لگتی ہیں یا پہلے سے کسی سوال کی تحقیق میں ذہن الجھا رہتا ہے اور یکایک روزمرہ کے ہی مشاہدات میں سے کسی ایک چیز پر نظر پڑتے ہی گتھی کا روہ!

سرا ہاتھ لگ جاتا ہے جس سے ساری الجھنیں حل ہو جاتی ہیں۔

ویسا ہی معاملہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ بھی پیش آیا۔ راتیں روزانہ آتی تھیں اور گذر جاتی تھیں سورج اور چاند اور تارے بھی آنکھوں کے سامنے ڈوبتے اور ابھرتے رہتے تھے لیکن وہ ایک خاص دن تھا جب ایک تارے کے مشاہدے نے ان کے ذہن کو اس راہ پر ڈال دیا جس سے بالآخر توحید الٰہی کی مرکزی حقیقت تک پہونچ رہے۔ ممکن ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا ذہن پہلے سے اس سوال پر غور کر رہا ہو کہ جن عقائد پر ساری قوم کا نظام زندگی چل رہا ہے ان میں کس حد تک صداقت ہے اور پھر ایک تارا یکایک سامنے آکر کشود کار کیلئے کلید بن گیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ تارے کے مشاہدے سے ہی ذہنی حرکت کی ابتدا ہوئی ہو اس سلسلے میں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جب ابراہیمؑ نے تارے کو دیکھکر کہا یہ میرا رب ہے اور جب چاند سورج کو دیکھکر انھیں اپنا رب کہا تو کیا اس وقت عارضی طور پر ہی سہی وہ شرک میں مبتلا نہ ہوگئے تھے اس کا جواب یہ ہے۔

کہ طالب حق اپنی جستجو کی راہ میں سفر کرتے ہوئے جن منزلوں پر غور و فکر کے لئے ٹھہرتا ہے اصل اعتبار ان منزلوں کا نہیں ہوتا بلکہ اصل اعتبار اس سمت کا ہوتا ہے جس پر وہ پیش قدمی کر رہا ہے اور اس آخری مقام کا ہوتا ہے جہاں پہونچکر وہ قیام کرتا ہے۔ بیچ کی منزلیں ہر جویائے حق کے

سے گزرنا گزیر ہیں ان پر ٹھہرنا بسلسلۂ طلب و جستجو ہوتا ہے نہ کہ بصورت فیصلہ

اصلاً یہ ٹھہراؤ سوالی اور استفہامی ہوا کرتا ہے نہ کہ حکمی۔ طالب جب ان میں سے

کسی منزل پر رک کر کہتا ہے کہ "ایسا ہے" تو دراصل یہ اس کی آخری رائے

نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایسا ہے؟ اور تحقیق سے اس کا جواب

نفی میں پاکر وہ آگے بڑھ جاتا ہے اس لئے یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ اثنائے راہ

میں جہاں جہاں وہ ٹھہرتا رہا وہاں وہ عارضی طور پر کفر و شرک میں مبتلا رہا

(تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۵۵۳ تا ۵۵۵ء م)

مودودی صاحب کے اس طویل بیان میں تین کھلی تصریح ہے۔

۱۔ یہ کہ انبیاء علیہم السلام وحی آنے سے پہلے جو علم رکھتے تھے اس کی نوعیت

علم انسانی علوم سے کچھ بھی مختلف نہ ہوتی تھی ان کے پاس نزول وحی سے پہلے

کوئی ایسا ذریعہ علم نہ ہوتا تھا جو دوسرے لوگوں کو حاصل نہ ہو۔

۲۔ یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس واقعہ سے پہلے موحد نہیں تھے یعنی انہیں

اس کے پہلے توحید کا علم حاصل نہ تھا اس واقعہ کے ذریعہ انہوں نے استدلالی

طریقہ پر علم توحید حاصل کیا اور موحد ہو گئے۔

۳۔ یہ کہ مذکورہ واقعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ زمانۂ نبوت سے پہلے

پہلے سن رشد کو پہونچنے کے بعد پیش آیا ہے۔

ہم ترتیب وار مودودی صاحب کی ان تحقیقات پر علمی تنقید و تبصرہ ناظرین

[illegible]

کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں اور اس سے فارغ ہونے کے بعد ہم اس
مغالطے کی حقیقت بھی واضح کریں گے جس کے ذریعہ مودودی صاحب نے
اپنے آخری جملوں میں کام نکالنے کی کوشش کی ہے۔

مودودی صاحب کی پہلی تحقیق اور اس پر تنقید و تبصرہ

مودودی صاحب کا یہ عقیدہ کہ

انبیاء کرام علیہم السلام کے پاس نبوت سے پہلے علم کا کوئی مخصوص ذریعہ نہیں ہوتا
لہٰذا وہ کسی چیز کا علم صرف انھیں ذرائع سے حاصل کرتے تھے جو عام لوگوں
کو حاصل ہے بالخصوص حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ان کا یہ خیال کہ سن
رشد کے بعد ان کو توحید کا علم حاصل ہوا اور اس وقت ان کو اپنی قوم کی گمراہی
اور کواکب کے باطل ہونے کا یقین حاصل ہوا ورنہ اس واقعہ کے پہلے وہ تو سرے
سے ان باتوں پر یقین ہی نہ رکھتے تھے یا کم از کم متحیر اور متردد تھے کوئی فیصلہ
نہیں کر پائے تھے یہ عقیدہ مودودی صاحب کی خط کشیدہ سطروں اور رسائل
و مسائل سے منقول سوال و جواب کی عبارت سے اس قدر واضح ہے کہ اس پر
مزید کچھ روشنی ڈالنے اور اس کی تشریح و توضیح کرنے کی قطعاً کوئی حاجت نہیں البتہ
اس سلسلے میں مودودی صاحب نے رسائل و مسائل کے اندر جن دو آیتوں کو
بطور دلیل استعمال فرمایا ہے ان کی اصل حقیقت کیا ہے اکابرین اہل سنت
اور معتمد علیہ مفسرین کی زبان سے نقل کر دینا ضروری ہے علاوہ ازیں اس طرح یہ بات

وما کنت تدری ما الکتاب ولا الایمان کے تحت لکھتے ہیں ۔

واشکلت الآیة بان ظاهرها یستدعی عدم الاتصاف بالایمان قبل الوحی ولا یصح ذالک لان الانبیاء علیهم الصلوٰة والسلام جمیعا قبل البعثة مؤمنون قطعا لعصمتهم عن الکفر باجماع من یعتد به واجیب بعدة اجوبة (روح المعانی ص ۲۵۰)

اس آیت پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ ظاہرا اس بات کی متقضی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو نبوت سے پہلے ایمان کا حاصل نہ ہوتا تو یہ کسی طرح درست نہیں کیونکہ جملہ انبیاء کرام علیہم السلام قبل نبوت بھی صاحب ایمان ہوتے ہیں اس لئے کہ وہ کفر سے معصوم ہوتے ہیں اس پر تمام معتمد لوگوں کا اجماع ہو چکا ہے ۔ اس اعتراض کا جواب چند طریقے سے دیا گیا ہے ۔

مزید جوابوں کی تفصیل کے لئے تفسیر کی کتابوں کی طرف رجوع کرنا چاہئے ہم اس جگہ صرف ان جوابات پر اکتفا کرتے ہیں جن کا علامہ آلوسی علیہ الرحمۃ نے ذکر فرمایا ہے۔

الاول ان الایمان هنا لیس المراد به التصدیق المجرد بل مجموع التصدیق والاقرار والاعمال (روح المعانی ص ۲۵۰)

پہلا جواب یہ ہے کہ ایمان سے اس جگہ صرف تصدیق مراد نہیں یعنی تصدیق قلبی اقرار لسانی اور اعمال تینوں کا مجموعہ مراد ہے ۔

مطلب یہ ہوا کہ آپ وحی سے پہلے اس مجموعہ کا علم نہیں رکھتے تھے ظاہر

کہ مجموعہ اور کل کے علم کی نفی سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ ان میں سے کسی ایک چیز کا بھی علم نہ رکھتے ہوں۔ تصدیق کا علم تو قبل وحی بھی حاصل تھا لیکن مجموعہ کا علم نہیں تھا اس لئے مجموعہ کے علم کی نفی درست ہو سکتی ہے اور ایمان کا لفظ تینوں کے مجموعہ پر اس جگہ بالکل اسی طرح بولا گیا ہے جیسا کہ آیت ما کان اللہ لیضیع ایمانکم کے اندر ایمان کا اطلاق اعمال ثلاثہ کے مجموعہ پر ہوا ہے۔

الثانی ان الایمان انما یعنی التصدیق باللہ تعالیٰ و برسولہ علیہ السلام

دوسرا جواب یہ ہے کہ ایمان سے تصدیق باللہ اور تصدیق بالرسولؐ کا مجموعہ مراد لیا جائے۔

اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قبل نبوت خود اپنی رسالت پر ایمان لانے کی کیفیت و تفصیل سے بے خبر تھے جب منصب رسالت پر فائز ہوئے تو یہ ضروری ہوا کہ سب سے پہلے خود اپنی رسالت پر آپ ایمان لائیں اس لئے آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ آپ ایمان کو نہیں جانتے تھے یعنی توحید کے ساتھ خود اپنی رسالت پر ایمان لانے کی حقیقت کو آپ نہیں جانتے تھے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ پہلے آپ توحید ہی کا علم نہ رکھتے ہوں۔

الثالث ان المراد شرائع الایمان ومعالمہ

تیسرا جواب یہ ہے کہ ایمان سے مراد شرائع و احکام اور شریعت کے ارکان ہیں۔

مطلب یہ ہوا کہ آپ نماز روزہ حج وزکوٰۃ وغیرہ کی تفصیل اور اِن ارکان شریعت
سے بے خبر تھے وحی کے ذریعہ ان امور کا علم آپ کو عطا کیا گیا لہٰذا ایمان سے مراد
اس جگہ ارکان شرع اور احکام تکلیفی ہیں ان کے نہ جاننے سے یہ لازم نہیں آتا
کہ نفس توحید سے بھی آپ بے خبر ہوں۔

الرابع انّ الکلام — چوتھا جواب یہ ہے کہ اس جگہ مضاف محذوف ہے
علیٰ تقدیر مضاف تقدیرہ — گویا اصل میں دعوۃ الایمان ہے . . .
دعوۃ الایمان . . . . . — یعنی آپ اس بات سے بے خبر تھے کہ لوگوں
کیف تدعو الخلق الی الایمان — کو ایمان کی طرف کس طرح دعوت دیں

اس جواب کا حاصل یہ ہوا کہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ آپ کو وحی کے پہلے یہ
بات معلوم نہ تھی کہ ایمان کی طرف لوگوں کو کس طرح بلایا جائے اور تبلیغ کس
طریقہ پر شروع کی جائے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ توحید سے ہی آپ بے خبر
ہوں طریقۂ کار کے نہ جاننے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ نفس کام سے ہی آدمی
بے خبر ہو۔

یہی جوابات اس آیت کے صحیح مفہوم کی وضاحت کرنے کے لئے بھی بہت
کافی ہیں جبکہ مودودی صاحب نے اپنے استدلال میں دوسرے نمبر پر جو
فرمایا ہے وہ یہ ہے "ووجدک ضالًا فھدیٰ" (والضحیٰ) اور اللہ نے تمہیں ناواقف
راہ پایا پھر تمہیں راستہ بتایا۔ یعنی ناواقف راہ سے مراد توحید سے ناواقف ہو

نہیں ہے جیسا کہ مودودی صاحب یقین کرنا چاہتے ہیں بلکہ گزشتہ جوابات
میں جن باتوں سے بے خبر ہونا بتایا گیا ہے انھیں سے ناواقف ہونا مراد ہے
مزید اطمینان کے لئے اس آیت کے تحت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ
نے جو کچھ فرمایا ہے اس کو نقل کرنا فائدے سے خالی نہ ہوگا تاکہ یہ بات بھی
معلوم ہو جائے کہ مفسرین نے جو توجیہات اس جگہ پیش کی ہیں ان سب کی
بنیاد کتاب و سنت ہی پر ہے چنانچہ شاہ صاحب اپنی تحریر میں اس مقام پر
ایک حدیث بھی نقل فرماتے ہیں۔

و اینجا اینقدر بالیقین باید دانست که
انبیا قبل از بعثت نیز از ضلال و کفر اصلی
و طبعی معصوم و محفوظ اند بلکه از معاصی نیز
در حدیث شریف آمده است که من هیچگاه قصد
نکرده ام که کاری از آن کارها کنم که اهل جاهلیت
میکردند مگر دو بار و در هر دو بار
به لطف الٰهی آن کار نکرده ام. در عصمت
الٰهی در میان من و در میان آن کار
حائل شد. و این دو کار اینست که روزی
من با جوانان قریش که همراه من

اس جگہ اتنی بات تو قطعی طریقہ پر جان لینا
چاہیے کہ انبیاء کرام نبوت سے پہلے بھی گمراہی
یا اصلی و طبعی کفر سے بلکہ تمام گناہوں سے
معصوم و محفوظ ہوتے ہیں حدیث شریف
میں ہے کہ میں نے کبھی بھی ارادہ نہیں کیا کہ
ان کاموں میں سے کوئی کام کروں جو اہل جاہلیت
کیا کرتے تھے مگر دو مرتبہ اور ان دونوں مرتبہ
بھی عنایت خداوندی سے وہ کام کرنے نہ پایا
خدا تعالیٰ کی عصمت میرے درمیان اور اس کام
کے درمیان حائل ہوگئی۔ وہ دو کام یہ ہیں

بعد از آن که جدا شدم مجلس برخاسته بود همین قسم بار دگر نیز قصد کردم و خواب در میان من و در میان مستمعان افتاد و سماع مزامیر حائل گشت و بعصمت او تعالیٰ محفوظ ماندم و از آن بعد هرگز قصد به چیز امور خاطر من نگذشت تا آنکہ حق تعالیٰ مرا برسالت خود نواخت و آن عصمت را دوبالا ساخت لیکن دانستن شرائع و تفصیل هر یافت آنها انبیا را قبل از بعثت نیز نمی باشد و دانستن راہ حق کی شود و این قدر برائے استعمال لفظ عصمت کافی است چنانکہ گذشت۔

(تفسیر عزیزی پارہ الم صفحہ ۲۲۱، ۲۲۲)

میں پھر بھی اسی طرح دوسری مرتبہ ارادہ کیا مگر نیند میرے درمیان اور باجوں اور راگ سننے کے درمیان حائل ہو گئی اور خدا تعالیٰ کی عصمت کے سبب میں محفوظ رہا پھر اسکے بعد کبھی کوئی غلط خیال میرے دل میں پیدا نہیں ہوا یہاں تک کہ خداوند تعالیٰ نے مجھے رسالت سے نواز دیا اور اس عصمت کو دوبالا کر دیا (شاہ صاحب فرماتے ہیں) لیکن احکام شرع کی واقفیت اور ان کے دریافت کرنے کی تفصیل نبوت سے پہلے بھی انبیاء کرام علیہم السلام کو ہوتی ہے اور وہ اس حق کے راستہ کی کھوج میں لگے رہتے ہیں اور یہی بات لفظ عصمت کے استعمال کے لئے بہت کافی ہے جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے۔

؎ اس سے معلوم ہوا کہ عصمت و حفاظت انبیاء کرام علیہم السلام کے حق میں مترادف و ہم معنی ہیں جیسا کہ اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد مولانا [illegible] ترجمان السنہ صفحہ ۲۴۰ [1] پر روحانی تحفظات لکھا ہے

انبیاء کرام کا قبل نبوت علیم و معصوم ہونا قرآن و حدیث سے ثابت ہے

جس طرح شاہ عبدالعزیز کی
پیش کردہ حدیث سے زمانۂ
نبوت کے قبل ہی سے آنحضور
صلی اللہ علیہ وسلم کا معصوم ہونا ثابت ہوتا ہے بالکل اسی طرح بعض احادیث
سے یہ بھی ثابت ہے کہ قبل نبوت سے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خداوند تعالیٰ
کی عبادت کیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ خدا کی وحدانیت کا عقیدہ رکھے بغیر
اس عبادت کا آپ کے بارے میں تصور کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ علاوہ بریں
حقیقت یہ ہے کہ توحید کا علم انبیاء علیہم السلام کو وہبی طور پر ولادت کے وقت
سے حاصل ہوتا ہے اور آگے چلکر ان کا انفس و آفاق میں غور کرنا یا کائنات کے
عجائبات قدرت سے ان کا استدلال کرنا اضافۂ یقین یا الزام خصم کی غرض سے
ہوتا ہے نہ کہ حصول علم کی غرض سے جیسا کہ اس مسئلہ پر آئندہ صفحات میں
پوری طرح روشنی ڈالی جائے گی اور اس وقت اس کے دلائل ذکر کئے جائیں گے
اس جگہ تو یہ بتانا مقصود تھا کہ مودودی صاحب نے جس آیت کو اپنے عقیدہ
کی دلیل کے طور پر پیش فرمایا تھا اس کا صحیح مطلب کیا ہے اور اکابر اہلسنت
سیر و تفسیر کی کتابوں میں اس کے متعلق کیا تحریر فرماتے ہیں جیسا کہ بالاختصار بیان
بھی کیا گیا مزید تفصیلی معلومات کے لئے متعلقہ آیت کی تفسیروں کا مطالعہ کرنا
چاہئے بہرحال اس جگہ ناظرین کو مودودی صاحب کی کم فہمی و بے علمی کا

کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور ہو گیا ہوگا اور یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی ہو گی کہ
مودودی صاحب کا یہ خیال کہ توحید کا علم حاصل کرنے کے لیے انبیاء علیہم السلام
کے پاس قبل نبوت عام انسانی ذرائع کے علاوہ کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہوتا اور
ہر چیز کا علم حتی کہ توحید کا علم بھی وہ انہیں عام ذرائع سے حاصل کرتے ہیں جو
تمام انسانوں کو میسر ہیں خالص غیر اسلامی عقیدہ ہے جس کے لئے دین میں قطعاً
کوئی گنجائش نہیں نکل سکتی کیونکہ زمانہ نبوت کے پہلے سے ہی انبیاء کرام علیہم السلام
کا خداوند تعالیٰ کی مخصوص نگرانی میں ہونا اور قدرت خداوندی کا ان کی نشوونما
سے لیکر اعمال و عقائد کی اصلاح و درستگی تک کیلئے خصوصی اہتمام کرنا قرآن
و سنت کا علمی مطالعہ رکھنے والوں سے پوشیدہ نہیں ہے بالخصوص علم عقائد
میں یہ امر تو بالکل بدیہی ہے جس کی بے شمار محققین نے تصریح کی ہے جیسا کہ اپنے
موقعہ پر حوالے بھی نقل کئے جائیں گے اور خود قرآن حکیم سے بھی واضح ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات قرآن پاک میں مختلف پہلوؤں پر جس کثرت کیساتھ
بیان کئے گئے ہیں بالخصوص زمانۂ نبوت سے پہلے ان کی ولادت و طفولیت
اور پرورش کے واقعات اللہ تعالیٰ نے جتنی تفصیل اور تکرار کے ساتھ ذکر کئے
ایسا شاید کسی دوسرے پیغمبر کے حالات کا ذکر قرآن میں اتنی کثرت سے نہیں
کیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ ؑ کے ان احوال کے ذریعہ قرآن کا مطالعہ کرنے والا
بلا کسی تامل کے یہ سمجھ سکتا ہے کہ زمانۂ طفولیت میں بھی خداوند تعالیٰ نے کیسی حفاظت

ونگرانی سے ایک لمحہ کے لئے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو محروم نہیں فرمایا
ورنہ ان کی زندگی جن خطرات اور بھیانک صورت حال سے دوچار تھی اس میں
حیات کا کوئی ظاہری امکان نہ تھا اللہ تعالیٰ نے فرمایا ۔

وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِي — وہ سب کچھ اس لئے کیا تاکہ تیری پرورش میری
نگاہ کے سامنے کی جائے ۔

معلوم ہوا کہ انبیاء کرام علیہم السلام زمانہ طفولیت سے لیکر شباب و
بلوغ کی منزل تک بلکہ قبل نبوت اپنی زندگی کے ہر لمحہ میں عام لوگوں سے منفرد
امتیاز رکھتے ہیں بایں معنی کہ قدرت اپنی عادت عامہ کے علاوہ خاص طور پر ان
کی حفاظت ونگرانی کرتی ہے اور ان کے اعمال وعقائد کے استوار کرنے میں
ہر وقت مصروف رہتی ہے ۔ علم وعمل کی راہ سے جو چیز بھی ان کے لئے
مضرت رساں اور نقصان کا سبب بن سکتی ہے ایسی ہر چیز سے ان کو کلی طور پر محفوظ رکھا
جاتا ہے بلکہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ انسانی ہدایت کے لئے جو سب سے بنیادی اور یقینی
عقیدہ توحید ہے فطرت الٰہی سے ان کو محروم رہنے دے ۔ حضرت یحییٰ
علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں ۔

وَآتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا — ہم نے ان کو لڑکپن ہی میں حکم عطا کر دیا ۔
اس جگہ حکم سے مراد فہم وفراست ہو یا نبوت ورسالت کچھ بھی مراد ہو سب سے
پہلی اور بنیادی چیز علم توحید ہے جس کے بغیر نہ کوئی فہم وفراست خداوند

تعالیٰ کی نگاہ میں علم سے تعبیر کیے جانے کی مستحق ہو سکتی تو رسالت و نبوت ہی
اس عقیدے کے بغیر معتبر ہو سکتی ہے پس اس آیت سے یہ حقیقت اظہر من الشمس
ہو جاتی ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے پاس زمانۂ نبوت کے بہت پہلے طفولیت ہی
کے وقت ہی سے حصول علم کا ایک ایسا مخفی ذریعہ ہوتا ہے جو دوسرے انسانوں
کو حاصل نہیں ہوتا۔ بخاری کی سب سے پہلی حدیث اس بات میں صریح ہے
کہ وحی کی آمد سے بہت پہلے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر الہام والقاء رؤیۂ
مبشرات و منامات صادقہ کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا جو اس بات کا واضح
ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ وحی کی آمد سے پہلے بھی انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیم
و تربیت کا کوئی ایسا ذریعہ ضرور موجود ہوتا ہے جو عام انسانی ذرائع کے علاوہ
شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں۔

تنزلا الٰہی نازل شود از فوق سبع سموات
بہ ملاء اعلیٰ۔ و ملاء اعلیٰ بہ آں رنگ
رنگین شوند و سیل سیل برکات ملاء اعلیٰ
بر نفسی قدسیہ فرود آید و ملاء اعلیٰ
برائے ایں نفس بصور مناسبہ متمثل شوند
و علوم شرعیہ و احسانیہ وغیرہ
در ایں نفس اندازند و ایں نفس

خدائی حکم سات آسمانوں کے اوپر سے
ملاء اعلیٰ میں نازل ہوتا ہے۔ ملاء اعلیٰ اس کی
رنگ میں رنگین ہو جاتا ہے اور ملاء اعلیٰ کے
برکات کا سیل رواں اس نفس قدسی یعنی
واسطۂ پیغمبر پر اترتا رہتا ہے پھر فرشتے
مناسب شکلوں میں اس نفس قدسی کے لیے
متمثل ہوتے ہیں اور شرعی احسانی علوم اس

پس تدبیر کبری کہ از فوق سبع سموات
نازل شدہ در سدرۃ المنتہیٰ باحکام مثالیہ
ملتفی گشتہ در ملاء اعلیٰ شائع
شد ۔ در زمین فرود آمدہ است
منطبق شود و بر حق مستعد یا غیر مستعد
کہ از عالم مجرد بحسب تعینات ایں ارادہ
نزول فرمود لباسی مناسب
ملاء اعلیٰ پوشیدہ بار دیگر لباس
الفاظ و حروف شہادی در برکردہ
بر قلب ایں پیغامبر نزول فرماید
دریں وقت در لسان شرع
گفتہ شود بعث اللہ
فلانا نبیا و امرہ
بتبلیغ الاحکام
و اوحی الیہ (ازالۃ الخفا ج ۱ ص ۱۰۰)

یعنی قدسی کے اندر ڈالتے رہتے ہیں۔ اور
یہ نفس قدسی محض اس تدبیر کے ذریعہ مطیع
ہو جاتا ہے جس سات آسمانوں سے نزول کر کے
سدرۃ المنتہیٰ میں احکام مثالیہ کا جامہ
پہن کر ملاء اعلیٰ کے اندر ظاہر ہونے کے بعد
زمین پر آتی ہے پھر حق مستعد یا غیر مستعد
جو اس ارادہ الٰہی کے ہمراہ عالم مجرد سے
آتی ہے اور ملاء اعلیٰ کے مناسب لباس میں
متشکل ہو کر دوبارہ ظاہری الفاظ و حروف
کا جامہ زیب تن کرنے کے بعد اس پیغمبر کے
قلب پر نازل ہوتی ہے اور اس وقت
شریعت کی زبان سے اعلان کیا جاتا ہے
کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں شخص کو نبی بنایا اور
اس کو احکام کی تبلیغ پر مامور کیا ہے اور
اس پر وحی اتاری ہے۔

دین کی معمولی بصیرت رکھنے والوں کو بھی یہ چیز معلوم ہے کہ آدم علیہ السلام
کی تخلیق کے بعد ابتدائے آفرینش میں ہی عالم ارواح کے اندر تا قیامت تک

ہونے والی اولادِ آدم سے اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کا عہد و میثاق لیا تھا
یہ معاہدہ خداوند تعالیٰ کی وحدانیت و ربوبیت سے متعلق ساری نسلِ آدم
سے روزِ ازل ہی لے لیا گیا ہے جو عہدِ الست کے نام سے معروف و مشہور ہے
اس عام معاہدے کے علاوہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے ایک دوسرا
مخصوص میثاق بھی روزِ ازل ہی لیا گیا ہے جس کا ذکر قرآن و حدیث میں
پوری صراحت سے موجود ہے۔ عالمِ ارواح کا یہ میثاق اس بات کی واضح دلیل
ہے کہ توحید کا علم انسان کی اصل فطرت میں داخل ہے رہی یہ بات کہ
دنیا میں آنے کے بعد عالمِ ارواح کے اس عہد کو چونکہ انسان بھول جاتا ہے
اور یہ میثاق انسان کے دل و دماغ سے بالکل نسیاً منسیا ہو جاتا ہے یہی
وجہ ہے کہ اس دنیا میں شرعاً اس پر کوئی حکم یا مواخذہ مرتب نہیں ہوتا لیکن یہ
بات اس جگہ یاد رکھنی چاہیے کہ عہدِ الست کا بھول جانا اور عالمِ اجسام
میں آنے کے بعد اس کا انسان کے ذہن و دماغ سے کلی طور پر محو ہو جانا عام انسانوں
کے لیے تو اپنی جگہ درست ہے مگر انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے حق
میں یہ بات کسی طرح قابلِ تسلیم نہیں۔ اس لیے کہ انبیاء علیہم السلام کی آمد
کا مقصودِ اعظم اسی عہدِ الست کو یاد دلانا ہوتا ہے پھر اگر وہ خود ہی میثاق
الست کو بھول چکے ہوں تو دوسرے کو کیونکر یاد دلا سکتے ہیں اور یہی وجہ
ہے کہ میثاقِ عام کے علاوہ ایک دوسرا مخصوص معاہدہ بھی انبیاء کرام علیہم

الصلوٰۃ والسلام سے اس روز لیا گیا تاکہ میثاق اول کی تائید اور اس کا استحضار باقی رہ سکے۔ یہ بات کہ انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اس دنیا میں عہد الست کی یاد دہانی کے لئے تشریف لاتے ہیں اور یہ میثاق عالم اجساد میں آنے کے بعد بھی انہیں مستحضر اور محفوظ رہتا ہے اس کا ذکر حدیث اور بعض علما کے اقوال میں پایا جاتا ہے چنانچہ مشکوٰۃ باب الایمان بالقدر کی آخری فصل میں ایک روایت کے اندر موجود ہے۔

واعلموا انہ لا الٰہ غیری ولا رب غیری ولا تشرکوا بی شیئا انی سارسل الیکم رسلی یذکرونکم عہدی ومیثاقی (مشکوٰۃ صفحہ ۲۳)

یہ ذہن نشین کر لو میرے سوا کوئی معبود نہیں اور نہ میرے علاوہ کوئی رب ہے اور میرا شریک کسی چیز کو نہ ٹھہرانا میں تمہارے پاس اپنے رسولوں کو بھیجوں گا جو میرے عہد و میثاق کی تمہیں یاد دہانی کرائیں گے۔

تفسیر صاوی میں ہے۔

ان الانبیاء لم تحجب ارواحہم بدخولہا فی الاشباح عن التوحید الاصلی الذی کانت فی یوم الست بربکم بل بعض الاولیاء کذالک (صاوی صفحہ ۳۹ ج ۲)

بلاشبہ انبیائے کرام علیہم السلام کی ارواح ان کے اجسام میں آنے کے بعد بھی اصلی توحید سے غافل نہیں ہوتے جو حاصل ہو چکی ہے یوم الست میں بلکہ یہی حال بعض اولیاء کا بھی ہے۔

چونکہ وحی کی آمد اور بعثت سے پہلے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام تبلیغ پر مامور نہیں ہوتے اس لئے توحید کی اعلانیہ اشاعت و تبلیغ زمانۂ نبوت سے پہلے وہ شروع نہیں کرتے لیکن اتنی بات بدیہی ہے کہ اپنی ذات کی حد تک ہر بات کا وہ پوری طرح لحاظ رکھتے ہیں اور یہ شان ہر وقت ان کے پیش نظر رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ زمانۂ نبوت سے پہلے بھی ایک لمحہ کیلئے بھی شرک کی گندگی سے آلودہ نہیں ہوپاتے بہرحال یہ حقیقت آفتاب نیم روز سے بھی زیادہ روشن ہے کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو قبل نبوت بھی علم کا ایک مخفی ذریعہ حاصل ہوتا ہے اسی طرح توحید کا علم بھی ان کی فطرت میں داخل ہوتا ہے۔ علامہ آلوسی علیہ الرحمۃ تحریر فرماتے ہیں۔

انه عليه السلام لم يزل
موحىٰ اليه و انه عليه السلام
متعبد بما يوحى اليه الا ان
الوحى السابق على البعثة
كان الهاماً ونفثاً في الروع
وما عمل بما كان من شرائع
ابيه عليهما الصلوٰة والسلام
الا بواسطة ذالك الالقاء

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زمانۂ نبوت سے پہلے بھی
ہمیشہ مہبط وحی رہے ہیں اور آپ نے
(اسی زمانے میں) اسی طریقے پر عبادت کی
ہے جو وحی کے ذریعہ آپ کو بتایا گیا تھا
لیکن یہ قبل نبوت کی وحی القاء قلب اور الہام
کے طور پر ہوتی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
اپنے جد اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہما الصلوٰۃ
والسلام کی شریعت پر عمل نہیں کرتے تھے

وإذا كان بعض إخوانه عليهم السلام من أوتي الحكم صبيا ابن سنتين أو ثلاث فهو عليه الصلاة والسلام أولى بأن يوحى إليه ذلك النوع من الإيحاء صبيا أيضا (روح المعانی صفحہ ۲۵۷)

تو اسی القاء والہام کے واسطے سے اور جب کہ آپ کے بعض بھائیوں یعنی انبیاء کرام علیہم السلام مثلاً حضرت یحییٰ علیہ السلام کو دو سال یا تین سال کی عمر ہی میں حکم عطا کر دیا گیا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بدرجۂ اولیٰ اس بات کے مستحق ہیں کہ اس قسم کی وحی آپ کے لئے بھی ثابت ہو

نیز آیت ماکنت تدری ما الکتاب ولا الایمان کی تفسیر کرتے ہوئے قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں۔

وهذا التفسير مبني على ما هو المسلم المتفق عليه أن الأنبياء عليهم الصلاة والسلام كانوا ملهمين من الله تعالى بالإيمان بالصانع المتوحد بصفات الكمال المنزه عن النقص قبل الوحي (تفسیر مظہری)

اس تفسیر کی بنیاد یہ ہے کہ تمام اہل علم کا اس امر پر اتفاق ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا قبل نبوت بذریعہ الہام اس خدا کی ذات پر ایمان ہوتا ہے جو اپنی صفات کمالیہ میں متفرد ہے اور ہر زوال و نقص سے منزہ اور مبرا ہے

ان وضاحتوں سے معلوم ہوا کہ خدا کی ربوبیت اور وحدانیت کا علم انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی فطرت میں اس طرح ودیعت کیا گیا ہے کہ وہ ان کا

مزاج بن چکا ہے حق کر اس دنیا میں آنے کے بعد قدرت اگر بات خبر انہیں قوت گویائی عطا کر دے اور ان کی زبانیں کھل جائیں تو سب سے پہلا کلمہ جو ان کی زبان سے ادا ہوگا وہ اپنی عبودیت اور خدا کی وحدانیت و ربوبیت کا اقرار ہوگا اس توحید کی شہادت کے بعد ہی کسی اہم مسئلے کے بارے میں وہ کچھ بول سکیں گے جیسا کہ قرآن حکیم میں اس کی ایک مثال بھی پیش کر دی گئی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ پر عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف عادت طریقے پر پیدا ہونے کی وجہ سے ان کی قوم نے بدکاری کا الزام لگا دیا خدا تعالیٰ نے حضرت مریم کی برأت و بیگناہی کی شہادت کے لئے عام عادت کے خلاف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان قبل از وقت کھولدی لیکن عیسیٰ علیہ السلام نے زبان کھلنے کے بعد اپنی والدہ کی معصومیت اور بیگناہی کی طرف توجہ کرنے سے پہلے عقیدۂ توحید کا اعلان و اظہار فرما دیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

قالوا كيف نكلم من كان في المهد صبيا قال اني عبد الله	(قوم کے لوگوں نے) کہا ہم اس سے کیونکر خطاب کریں جو گود کے اندر بچے کی حیثیت میں حضرت عیسیٰ بول پڑے میں اللہ کا بندہ ہوں

علامہ نسفی فرماتے ہیں۔

انطقه بالعبودية وهو	حضرت عیسیٰ نے جس وقت اپنی عبودیت کا اقرار

ابن أربعین لیلة أو ابن یوم (تفسیر مدارک ج۳ ص۲۰)

کیا ہے چالیس دن یا صرف ایک ہی دن کے تھے۔

اس آیت کے ذیل میں علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں۔

وأول شیء تکلم به أن نزه جناب ربه تعالی وبرأه عن الولد وأثبت لنفسه العبودیة لربه تعالی۔ (تفسیر ابن کثیر ج۳ ص۱۱۸)

حضرت عیسیٰؑ کی گفتگو کا سب سے پہلا جملہ یہ تھا کہ انھوں نے خداوند تعالیٰ کی تقدیس بیان کی اور اس کے لئے اولاد ہونے کی نفی کی اور اپنے حق میں اللہ تعالیٰ کی عبودیت کا اظہار کیا۔

کتاب و سنت اور اکابر علمائے امت کی یہ تصریحیں اس بات کا قابل اطمینان ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ انبیاء کرام علیہم السلام زمانۂ نبوت کے پہلے بھی ملہم ہوتے ہیں اور ان کے پاس علم کا ایک مخفی ذریعہ ایسا بھی ہوتا ہے جو عقل و حواس اور فکر و استدلال کے عام طریقے سے بالکل جدا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولی حالات کا علم رکھنے والے مسلمان بھی اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ منصب رسالت و نبوت پر سرفراز کئے جانے سے پہلے شق صدر کا واقعہ آپؐ کی ذات بابرکات سے

لہ اخرجه سعید بن منصور و ابن عساکر عن ابن عباس (روح المعانی ج۱۶)

سامنے پیش آیا۔ روایتوں کے اندر اس واقعہ کے ضمن میں اس کا واقعہ موجود ہے کہ سینۂ اقدس چاک کرنے کے بعد اس کی تطہیر کی گئی اور اس کو علم و حکمت سے پُر کر دیا گیا یا پھر کسی کا بلا تخصیص یہ دعویٰ کیونکر درست ہو سکتا ہے کہ قبل نبوت عام ذرائع کے علاوہ انبیاء کرام علیہم السلام کے لئے کوئی مخصوص و مخفی ذریعۂ علم ثابت نہیں ہے اسی طرح یہ بات بھی ہرگز ماننے کے قابل نہیں کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو توحید کا علم غور و فکر اور استدلال کرنے کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے اور کسب و استدلال کے بغیر کسی نبی کو وہبی طور پر یہ علم حاصل نہیں ہوتا۔

مودودی صاحب کی دوسری تحقیق اور اس پر تنقید و تبصرہ

یہ دعویٰ کرنا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس واقعہ سے پہلے موحد نہ تھے یعنی انھیں اس کے پہلے توحید کا علم حاصل نہ تھا اس واقعہ کے ذریعہ انھوں نے استدلالی طور پر علم توحید حاصل کیا اور موحد ہوئے یہ کسی طرح درست نہیں اس لئے کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ذات قدسی صفات کا تو معاملہ ہی جدا ہے عام انسانوں کی پیدائش بھی سادہ لوحی اور بے گناہی پر ہوتی ہے۔ ماں کے پیٹ سے کوئی شخص گناہ کی آلائش لئے ہوئے نہیں آتا۔ ہر شخص کا لوح فطرت سادہ اور بے داغ ہوتا ہے لیکن لوح فطرت کی

یہ سادگی اور انسان کی یہ فطری بھولپنا ہی جو قدرت کا عطیہ ہے
نفس شیطان اور ماحول کے غلط اثرات سے رفتہ رفتہ متاثر ہوتی رہتی
ہے برے ماحول اور گرد و پیش کے غلط اثرات سے اس پر بدنما نقوش
پڑ جاتے ہیں اس طرح اس کی فطری سادگی رفتہ رفتہ ختم ہو جاتی ہے اور اس
کے لوح فطرت پر ہزاروں داغ پڑ جاتے ہیں لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
کہ انسان کی اس فطری سادگی کو قدرت کی طرف سے محفوظ رکھا جاتا ہے
اور ماحول کے غلط اثرات کی وجہ سے خداوند تعالیٰ کی خاص نگرانی کے
سبب داغدار ہونے سے بچ جاتی ہے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام
کے ساتھ یہی صورت پیش آتی ہے اس لئے قدرت کی اس عام فیاضی کے
اصول سے انبیاء کرام علیہم السلام کو محروم رکھنا کسی طرح معقول بات نہیں ہے،
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ کا ارشاد ہے

انی خلقت عبادی حنفاء ۔ میں نے اپنے سارے بندوں کو حنفاء
کلھم (مسلم) بھیجا ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لفظ حنفاء کی وضاحت
فرماتے ہیں۔

حنفاء ای مستعدین لقبول[۱] یعنی قبول حق کے لئے مستعد اور تیار ہے

۱؎ ابن کثیر و ازالۃ الخفاء۔

یعنی بری ہوں من الشرک [illegible] سے بری ہوتے ہیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دنیا میں آنے والا ہر بچہ اپنی فطرت کے لحاظ سے شرک سے بری ہوتا ہے اور خداوند تعالیٰ کی توحید والوہیت کا عقیدہ لئے ہوئے آتا ہے یا کم از کم اس کے قبول کرنے کی استعداد اس کے اندر موجود ہوتی ہے اس سے بھی زیادہ واضح طریقے پر اس مسئلے کو حدیث ذیل کے اندر بیان کیا گیا ہے۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما من مولود الا یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ وینصرانہ او یمجسانہ کما تنتج البھیمۃ بھیمۃ جمعاً ھل تحسون فیھا من جدعاً ثم یقول فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا۔ لا تبدیل لخلق اللہ ذلک الدین القیم۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کوئی بچہ نہیں ہے مگر یہ کہ وہ اصل فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے والدین اس کو یہودی بنا لیتے ہیں یا نصرانی بنا لیتے ہیں یا مجوسی بنا لیتے ہیں جیسے کہ جانور سالم بچہ دیتا ہے کیا تم اس میں کسی کو ناقص العضو پاتے ہو اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت کی فطرۃ اللہ التی الخ اللہ کی تخلیق ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے خدا کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی یہی دین قیم

(متفق علیہ مشکوٰۃ صفحہ ۲۱ ج۱) ہے ۔

بخاری و مسلم کی اس صحیح روایت سے یہ بات صاف طریقے پر سامنے آجاتی ہے کہ دنیا میں آنیوالا ہر بچہ دین فطرت اور عقیدۂ توحید پر ہی ہوتا ہے ماحول کے اثرات سے رفتہ رفتہ اس کی فطرت اگر مسخ نہ ہو جائے تو اس کا دین اسلام ہی مانا جائے گا۔ اس حدیث کے ضمن میں قرآن پاک کی جو آیت آگئی ہے اس کی تفسیر اور حدیث مشہور کی شرح کرتے ہوئے علمائے محققین جو کچھ تحریر فرماتے ہیں اس کا ماحصل یہ ہے شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ۔

والمشهور أن المراد بالفطرة	اس میں سے مشہور معنیٰ یہ ہے کہ فطرت سے
الدين الذي شرع وابتدأ	مراد وہ دین ہے جو انسان کے ہر زمولود
وخلق له ولد مفطور من البشر	بچے کے لئے ابتدا ہی میں مخلوق و مشروع
وهو التوحيد ودين الإسلام	کیا گیا ہے یہ توحید اور دین اسلام ہے
وقد وقع في رواية ما من	اور ایک روایت میں یہ ہے کہ کوئی بچہ نہیں
مولود إلا وهو على الملة	پیدا ہوتا مگر یہ کہ وہ ملت پر ہوتا ہے
وفي رواية الترمذي كل	اور ترمذی کی روایت کے اندر ہے کہ کوئی
مولود يولد على الملة والملة	بچہ پیدا نہیں ہوتا مگر یہ کہ وہ ملت پر قائم
هو دين الإسلام (لمعات صفحہ ۱۵۰ ج۱)	ہوتا ہے اور ملت دین اسلام ہی ہے ۔

شیخ نے ترمذی کی روایت کا حوالہ دیتے ہوئے یہ مشہور معنی تحریر کرنے کے بعد اس حدیث کا ایک اور مطلب بیان فرمایا ہے جو ان کے خیال میں زیادہ درست ہے فرماتے ہیں۔

فالصواب أن المراد بالفطرة التي خلق الله الخلق عليها الحالة والهيئة المتهيئة لمعرفة الخالق وقبول الحق واختيار دين الإسلام والتمييز بين الحق والباطل ما ركب فيهم من العقول التي يتمكنون بها من الهدى وقبول الحق ولو تركوا ونظرهم نظروا صحيحا لاستمروا على لزومها ولم يفارقوها إلى غيرها كما أنه يولد على محبة ارتضاع اللبن (لمعات ص [illegible])

پس صحیح یہ ہے کہ اس فطرت سے مراد جس پر انسان کی تخلیق کی گئی ہے وہ حیات حالت ہے جو قبول حق اور خالق کی معرفت اور دین اسلام کے اختیار کرنے اور حق و باطل کے درمیان تمیز کرنے کے لئے ودیعت کی گئی ہے جو عقل و شعور ان میں اور قبول حق کی غرض سے انسانوں کے اندر رکھے گئے ہیں اگر ان سے صحیح غور و فکر کا کام لیں تو وہ اسی ابتدائی حالت و ہیئت پر مزید باقی رہیں گے اور اس سے ہٹ نہیں سکتے جس طرح بچہ دودھ پینے کی خواہش پر اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک اس کو اس کی خواہش سے روکا نہ جائے۔

اس کے بعد دونوں مفہوموں کے درمیان جو ظاہری اور معمولی سا اختلاف نظر آتا ہے تھوڑی سی توجیہ کر لینے کے بعد شیخ لکھتے ہیں کہ معنی مشہور اور اس معنی کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے فرماتے ہیں۔

فہذا خلاف بین التاویلات (لمعات صفحہ)	پس دونوں معنی کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔

امام نووی حدیث کا معنی اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

الاصح ان معناہ ان کل مولود	اصح معنی یہ ہے کہ ہر بچہ اسلام کے لئے
یولد متھیأ للاسلام	مستعد پیدا ہوتا ہے . . . .
. . . .	. . . .
وان مات قبل بلوغہ الاصح انہ	اور اگر اس کے بلوغ سے پہلے موت واقع
من اھل الجنۃ (نووی صفحہ)	ہو گئی تو زیادہ صحیح یہی ہے کہ وہ جنتی ہوگا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بخاری و مسلم کی اس حدیث میں سورہ روم کی جس آیت کو بطور استشہاد ذکر فرمایا ہے اس کے تحت علامہ صاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ وہی معنی مشہور جو شیخ عبد الحق کے حوالے سے اوپر گذر چکا ہے اس کو نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔

وقیل انھا الخلقۃ والطبیعۃ	اور کہا گیا کہ اس سے مراد وہ فطرت و طبیعت
التی فی نفس الطفل تکون	ہے جو بچوں کی ذات میں موجود ہوتی ہے

بها مهيئا لمعرفة ربه ليس
بين قلوبهم ومعرفة ربه
حجاب كما خلق اسماعهم
وابصارهم قابلة للمسموعات
والمبصرات فما دامت باقية
على تلك الهيئة ادركت
الحق ودين الاسلام ولا يمنعها
منهم الا وساوس الشياطين بعد
البلوغ ولذا كان كل من مات
من بنی آدم قبل بلوغه
في الجنة وان كان من اولاد
المشركين وهذا القول قريب من
معنى القول الاول (تفسير مظهری ص ۱۳۳ ج ۳)

جس کے ذریعہ وہ اپنے خدا کی معرفت کے
لیے مستعد ہوتا ہے ان کے دلوں اور ان کے
رب کی معرفت کے درمیان کوئی حجاب نہیں
ہوتا جس طرح ان کے کان اور ان کی آنکھیں
مسموعات ومبصرات کے قابل پیدا کی گئی
ہیں لہذا یہ فطرت جب تک اس صورت پر باقی
ہے حق اور دین اسلام کا ادراک کرتی ہے
اور اس کو اس سے شیطانی وساوس جو بلوغ کے
بعد ہی ان کے مانع بنتے ہیں۔ یہی وجہ ہے
کہ جو بچہ بلوغ کے قبل ہی مرجاتا ہے وہ
جنتی مانا جاتا ہے اگرچہ وہ بچہ مشرکین
کی اولاد میں سے ہوتا ہے اور یہ قول پہلے
قول کے بالکل قریب المعنیٰ ہے۔

دوسری روایات کے الفاظ خصوصاً ترمذی کے حوالہ سے جو روایت
شیخ نے نقل کی ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے اور بخاری ومسلم کی حدیث
کے اندر جو مسئلہ کی وضاحت کے لئے بہیمہ کی مثال ذکر کی گئی ہے ان
تمام امور پر غور کرنے سے معنی مشہور ہی کی تائید ہوتی ہے علاوہ بریں اگر

معنی ثانی کو بھی درست تسلیم کر لیا جائے جب بھی حدیث سے یہ مسئلہ واضح ہے کہ ہر بچہ کا پیدائشی مذہب دین فطرت ہی ہے اور اگر بلوغ سے پہلے پہلے ماحول اور والدین کے خارجی دباؤ سے وہ محفوظ رہ گیا ہے تو وہ فطرت ملت ہی پر باقی رہتا ہے اور عقیدۂ توحید وہبی طور پر اسے حاصل ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس حالت میں اگر اس کی موت واقع ہو جاتی ہے تو اس کا شمار جنتیوں میں کیا جاتا ہے اس عام اصول سے قطع نظر کرتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سلسلہ میں سورۂ انعام رکوع ۹ کے تحت جو کچھ مفسرین نے تحریر فرمایا ہے اس سے بھی مودودی صاحب کے مذکور الصدر دعویٰ کی تردید ہوتی ہے اس لئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ستاروں کی طرف دیکھنا ناظر کی حیثیت سے ہرگز نہ تھا یعنی یہ دیکھنا اس لئے نہ تھا کہ ستاروں میں غور و فکر کر کے اس کے ذریعہ وہ توحید کا علم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ حافظ ابن کثیر اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

فکیف یکون ابراھیم الخلیل الذی
جعلہ اللہ امۃ قانتا للہ حنیفا
ولم یکن من المشرکین ناظرا
فی ھذا المقام بل ھو اولی
الناس بالفطرۃ السلیمۃ

پس حضرت ابراہیم خلیل اللہ اس مقام پر غور
و فکر کرنے والے کی پوزیشن میں کیونکر ہو سکتے
ہیں جب کہ خدا تعالیٰ نے جماعت کا پیشوا، اپنا
مطیع اور خالص توحید پرست بنایا اور مشرکوں
میں سے نہ ہونے دیا بلکہ حق یہ ہے کہ وہ سب

والنجیبۃ المستقیمۃ	سواء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد
بعد رسول اللہ بلا شک	سارے انسانوں سے زیادہ سلامتی طبع
	اور فطرت مستقیمہ کے بلا شک وشبہ
ولا ریب	حقدار ہیں۔

(تفسیر ابن کثیر صفحہ ۱۵۳ ج ۲۹)

جملہ ارباب تحقیق اور اہل سنت اصحاب تفسیر متعلقہ آیت کے سلسلہ میں متفق اللسان ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اس موقعہ پر چاند، سورج یا ستاروں کے بارے میں ھٰذا ربی کہنا اس لئے نہ تھا کہ وہ ان مخلوقات سے ذریعہ خدا کی وحدانیت کا سراغ لگانا چاہتے تھے اور چونکہ ابھی منزل مقصود تک پہنچ نہیں پائے تھے یعنی اصل حقیقت منکشف نہ ہونے پائی تھی اس لئے درمیان سفر اور اثنا راہ میں ان مخلوقات کی الوہیت کا اعتراف کرتے جاتے تھے بلکہ تمام معتبر مفسرین کا فیصلہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خدا کی الوہیت کا عقیدہ اس واقعہ کے بہت پہلے سے ہی حاصل تھا اس جگہ ان کا یہ اعتراف اپنی قوم پر حجت قائم کرنے کے لئے تھا یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ اعتراف و استدلال خود اپنے لئے نہ تھا بلکہ قوم کے عقیدہ کو فرضی طریقہ پر تسلیم کر لینے کے بعد مجادلات مع الخصم اور ارخاء عنان کے انداز میں اس کا رد و ابطال کرنا مقصود تھا گویا قوم کے ہی عقیدے سے ان پر الزام

قائم کرنا چاہتے تھے اس طریقہ کو اصطلاحی زبان میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس موقع پر ناظر نہ تھے بلکہ ان کی حیثیت مناظر کی تھی مشہور محقق علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں۔

والحق ان ابراهيم عليه الصلوٰة والسلام كان في هذا المقام مناظراً لقومه مبيناً لهم بطلان ما كانوا عليه (ابن كثير ص ۱۵۱)	اور حق بات تو یہی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اس موقع پر اپنی قوم کے لیے مناظر کی حیثیت رکھتے تھے ان کے باطل عقائد جن پر وہ لوگ قائم تھے ان کا بطلان واضح کرنا چاہتے تھے۔

نیز تمام مفسرین ایک زبان ہو کر اس اعتراف کو حقیقی اعتراف پر محمول کرنے کی تردید کرتے ہیں اور پوری قوت کے ساتھ اس بات کا انکار کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حق میں ستاروں کی الوہیت کے اقرار کر لینے پر اس کو محمول کیا جائے اگرچہ درمیان سفر اور اثنائے راہ کے طور پر کیوں نہ ہو کیونکہ یہ بات ایک پیغمبر کی شان سے بعید ہونے کے علاوہ خود

۱؎ ابن کثیر کہتے ہیں کہ اس آیت میں وحاجه قومه کا جملہ موجود ہے جو اسی بات کا واضح ثبوت فراہم کرتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی قوم سے ایک مناظر کی حیثیت سے ان کے خلاف حجت قائم کر رہے تھے۔

قرآن کے اس بیان کے بھی صریح خلاف ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں اس کے اندر پیش کیا گیا ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی علیہ الرحمۃ تفسیر مظہری میں رقم طراز ہیں۔

وکیف یتوھم ھذا الشرک من	اس طرح کا وہم بھی اس ذات کے متعلق
عصمہ اللہ وطہرہ وآتاہ رشدہ	کیونکر کیا جا سکتا ہے جس کو خدا نے معصوم
من قبل قال ماقال المفسرون قال اللہ	بنایا ہے اور جس کو پہلے سے ہی ہدایت دے
تعالیٰ ولقد آتینا ابراھیم	رکھی تھی۔ شفا میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا
رشدہ من قبل	ارشاد ہے ولقد آتینا ابراھیم
ای ھدیناہ صغیرا	رشدہ من قبل حضرت مجاہد وغیرہ
قالہ مجاھد وغیرہ	(اس آیت کی تفسیر میں) کہتے ہیں یعنی حضرت
(مظہری صفحہ ۲۵۹)	ابراہیم کو کمسنی ہی میں ہی ہدایت دے دی تھی

حضرت علامہ آلوسی علیہ الرحمۃ اس بات کی تردید کرتے ہوئے کہ فی الواقع حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں کی الوہیت کا ایک لمحہ کے لیے بھی اعتراف کیا ہو تحریر فرماتے ہیں۔

وقد قص اللہ تعالیٰ من	اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام
حال ابراھیم علیہ السلام	کا جس طرح حال بیان فرمایا ہے بالخصوص
خصوصاً فی صغرہ مالا یتوھم منہ	ان کی صغر سنی کے متعلق جو کچھ بیان

شبهة ... يتأتى	فرمایا ہو ان کے بعد پھر کسی انکار ہم ہو ہی
ذلك منا التوجيه	نہیں سکتا۔ جس کے اندر اس بیان کے
الأحد ... غير	منافی ہونے کا ادنیٰ درجہ بھی کوئی شائبہ
(روح المعانی صفحہ ١٩٩)	پایا جا سکے لہٰذا جملی تفسیر یعنی وہی کہ یہ
. . . . . .	... اور وہی بات صحیح (اقصیٰ ہو) کے
. . . . . .	سوا کوئی درست نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم سے متعلق جو کچھ ذکر فرمایا ہے خصوصاً ان کے زمانہ طفولیت کے بارے میں قرآن نے جو باتیں بیان کی ہیں ان سب کو دیکھتے ہوئے اس بات کی قطعاً کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ستاروں کے بارے میں ھٰذا ربی کہنا ان ستاروں کی الوہیت کے واقعی اقرار و اعتراف کے طور پر تھا اس چیز کا ان پر شبہ کیونکر کیا جا سکتا ہے جب کہ ان کے متعلق قرآن کا واضح بیان ہے

إن إبراهيم كان أمة	یقیناً ابراہیم پیشوا، خدا کے مطیع، یکسو
قانتا لله حنيفا ولم يك من	موحد تھے اور ہرگز وہ مشرکوں میں
المشركين (پارہ ١٤)	سے نہ تھے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا اِبْرَاھِیْمَ رُشْدَہٗ مِنْ قَبْلُ ۔ — ہم نے ابراہیمؑ کو اس کی ہدایت پہلے ہی دی تھی ۔

گزر چکا ہے کہ حضرت مجاہد وغیرہ نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ زمانۂ طفولیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو راہ حق کا عرفان حاصل ہو چکا تھا پس حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق قرآن کی ان تصریحات کے خلاف یہ کس طرح باور کر لیا جائے کہ ستاروں کے دیکھنے سے پہلے وہ خدا کی الوہیت کے عقیدہ سے بالکل خالی تھے اور مشرکانہ ماحول میں پیدا ہونے کی وجہ سے انھیں راہ حق اب تک نہیں مل سکی تھی اس واقعہ سے پہلے انھوں نے حصول توحید کی غرض سے غور و فکر کے ذریعہ سفر شروع کیا تھا اور اثنائے راہ میں ان ستاروں کی واقعی الوہیت کا اقرار کرتے جاتے تھے لیکن یہ اقرار و اعتراف اثنائے راہ میں ہی تھا؟ لہٰذا محض مودودی صاحب کے فرما دینے کی وجہ سے قابل اعتبار نہیں ہو سکتا حالانکہ اس بات کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے جو کچھ اس موقع پر مولانا مودودی صاحب نے تحریر فرمایا ہے بالکل اسی انداز کی بات ابو مسلم نے اس آیت کے تحت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں کہا ہے۔

فَنَظَرَ نَظْرَۃً فِی النُّجُوْمِ فَقَالَ — انھوں نے ایک بار ستاروں میں دیکھا

اِنِّیْ سَقِیْمٌ (پارہ ۲۳) — پھر کہا میں سقیم ہوں۔

اس کا مطلب ابو مسلم بیان کرتے ہیں۔

ان المعنى نظر و
تفكر في النجوم ليستدل
باحوالها على حدوثها
وانها لا تصلح ان
تكون آلهة فقال اني
سقيم - اي سقيم النظر
حيث لم يحصل له
كمال اليقين -

معنی یہ ہے کہ حضرت ابراہیم نے ستاروں میں غور و فکر اس خیال سے کیا تھا کہ ان کے حالات سے ان کے زائل ہونے پر اور اس بات پر استدلال کریں کہ وہ الٰہ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے لیکن حضرت ابراہیم نے کہا میں سقیم ہوں یعنی یہ کہا کہ میری نگاہ میں سقم ہے یہ انھوں نے اس لئے کہا تھا کہ وہ اثنائے راہ میں سقیم اور انہیں کامل یقین حاصل نہ ہو سکا تھا۔

ہر شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ ابو مسلم نے وہی بات کہی تھی جس کو مودودی صاحب کہنا چاہتے تھے یعنی صرف لفظی ہیر پھیر سے بالکل یہی چیز مودودی صاحب نے آیت زیر بحث میں پیش کرنا چاہا ہے اس لئے دونوں باتیں حقیقت میں ایک ہی ہیں اب غور فرمائیے ابو مسلم کے اس خیال کے بارے میں علماء کیا حکم صادر فرماتے ہیں۔ مفتی بغداد علامہ آلوسی علیہ الرحمۃ ابو مسلم کا مذکور بالصدر قول نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

وهذا لعمري ليس بشيء

میں اپنی حیات کی قسم کھا کر کہتا ہوں

فیما ادعی عن ابی مسلم الاسلام و فیہ من الحط بمقام الانبیاء لاسیما الخلیل علیہم السلام (روح المعانی صفحہ ۱۱۳ جلد ۷)

و میرا خیال ہے کہ یہ بات ابو مسلم سے اس سے کا ایمان سلب کر لینے والی ہے یعنی یہ بات دائرہ سے خارج کر دینے والی ہے) اور اس قول میں انبیاء علیہم السلام بالخصوص حضرت ابراہیم کے مقام نبوت سے جہالت کا اظہار ہوتا ہے۔

اب فیصلہ ناظرین کے ذمہ ہے وہ خود غور کریں کہ مولانا مودودی نے اس موقع پر کتنی خطرناک غلطی کی ہے اور اپنی تفسیر کے مطالعہ کرنے والوں کے ذہن میں کیا چیز داخل کرنے کی کوشش کی ہے۔

مولانا مودودی کی تیسری تحقیق اور اس کا تنقیدی جائزہ

اب تک جو تفصیلات پیش کی گئی ہیں ان سے معلوم ہو چکا ہے کہ اس موقع پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں کی واقعی الوہیت کا اقرار کیا تھا بلکہ جمہور محققین کے نزدیک ان کا یہ اعتراف محض اپنی قوم پر الزام قائم کرنے کے لئے ارخاء عنان اور مجارات مع الخصم کے طور پر تھا۔ ظاہر ہے اپنی قوم کے ساتھ بحث و مباحثہ یا اتمام حجت سن شعور اور بلوغ کے بعد ہی کیا ہوگا جیسا کہ دوسرے قرائن و شواہد سے اس کی تائید ہوتی ہے اس لئے بعض لوگوں نے ان کے اس اعتراف

کو ارخاء عنان اور الزام خصم پر محمول کیا ہے ان کے نزدیک صحیح یہی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ یہ واقعہ سن بلوغ کے بعد پیش آیا ہے ان کا یہ قول مجاراۃ مع الخصم کے قبیل سے ہے۔ علامہ خازن فرماتے ہیں۔

والقول الثانی الذی علیه جمهور المحققین ان هذه الرؤیة وهذا القول کان بعد بلوغ ابراهیم وحین شرفه الله بالنبوة واکرمه بالرسالة (تفسیر خازن ص ۲۰/۲)

اور دوسرا قول جس پر جمہور محققین ہیں وہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ستاروں کی طرف دیکھنا اور یہ گفتگو کرنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بالغ ہونے کے بعد اور اس وقت کا واقعہ ہے جب انہیں شرف نبوت سے نوازا گیا تھا اور منصب رسالت پر سرفراز کر دیا گیا تھا۔

لیکن اس کے برخلاف حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس اعتراف کو ستاروں کی واقعی الوہیت کے اقرار پر جن لوگوں نے محمول کرنا چاہا ہے ان سے قطع نظر کہ یہ بات بجائے خود غلط ہے لیکن انھوں نے بھی اس احتیاط کی سخت ضرورت محسوس کی ہے کہ اس صورت میں واقعہ قبل بلوغ اور سن شعور کے پہلے کا مانا جائے تاکہ نبوت اور بلوغ یا سن شعور کے زمانے سے ایک پیغمبر کی طرف شرک کی نسبت نہ کرنی پڑے مگر مودودی صا

نے اس جگہ دو دو غلطی کا ارتکاب کیا ہے وہ اس طرح کہ ایک طرف وہ اس واقعہ کو سنِ شعور کے بعد اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سنِ رشد کو پہونچنے کے بعد کا واقعہ مانتے ہیں اور دوسری طرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اقرار کو ستاروں کے واقعی الوہیت کا اقرار تسلیم کرتے ہیں۔ آخری بات ان کی تحریر کے حوالے سے پہلے گذر چکی ہے اور اس پر تفصیلی نقل و تبصرہ بھی ناظرین کے سامنے آچکا ہے اس بحث میں ان کے اس نظریے کی تنقید اور اس کا تجزیہ پیش کرنا ہے کہ یہ واقعہ ستاروں کی واقعی الوہیت کے اقرار و اعتراف کی صورت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سنِ رشد کو پہونچنے کے بعد کا ہے جیسا کہ مودودی صاحب باور کرانا چاہتے ہیں حالانکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس قول کو جن لوگوں نے واقعی الوہیت کے اقرار پر محمول کیا ہے انھوں نے واقعہ سن رشد اور بعد بلوغ کا قرار دیا ہے اگرچہ ان کے اس نظریہ کی اکابر مفسرین نے تردید کی ہے اور اس خیال کو بالاتفاق باطل قرار دیا ہے امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

منھم من قال ان ھذا	جن لوگوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے
کان بعد البلوغ	اس قول کو واقعی الوہیت کا اقرار سمجھا ہے)
وجریان قلم التکلیف	ان میں سے کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ یہ واقعہ
علیہ و منھم من	بلوغ اور قلم تکلیف کے جاری ہونے کے

قال ان ھذا کان قبل البلوغ و اتفق اکثر المحققین علی فساد القول الاول واحتجوا علیہ بوجوہ (تفسیر کبیر میں)

بھلکا ہے اور ان میں سے کچھ لوگ جس بات کے قائل ہیں کہ واقعہ بلوغ سے پہلے کا ہے مگر محققین کی اکثریت نے پہلے قول کے باطل ہونے پر اتفاق کیا ہے اور اس کے خلاف مختلف دلائل سے استدلال کیا ہے۔

اس کے بعد امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے بارہ دلائل کے ذریعہ ان لوگوں کے خلاف حجت قائم کی ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اس قول کو ستاروں کے واقعی الوہیت کے اعتراف و اقرار پر محمول کرتے ہوئے بھی واقعہ زمانۂ بلوغ کا تسلیم کرتے ہیں۔ دلائل کی تفصیل و وضاحت کے لیے تفسیر کبیر کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ میں نے اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کو ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا علاوہ بریں دوسرے محققین نے اس کی بھی تردید کی ہے کہ واقعی اقرار الوہیت پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس قول کو محمول کر کے واقعہ بلوغ کے پہلے کا مانا جائے اور یہ کہا جائے کہ زمانۂ بلوغ کے پہلے پہلے صغر سنی اور طفولیت کی حالت میں تکلیف شرعی نہ ہونے کی وجہ سے کفر و شرک یا توحید کے معاملے میں تحیر و تردد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے مضر نہیں ہے تو اس خیال کی تردید

کرتے ہوئے علامہ خازن تحریر فرماتے ہیں۔

قالوا هذه الآية دلت على نوع تحير وذلك لا يكون إلا في حال الصغر قبل البلوغ وقيام الحجة وهذا القول ليس بسديد ولا مرضي لأن الأنبياء معصومون في كل حال من الأحوال وأنه لا يجوز أن يكون لله عز وجل رسول يأتي عليه وقت من الأوقات إلا وهو بالله عارف وله موحد ومن كل معصية منزه ومن كل معبود سواه بريء وكيف يتوهم على إبراهيم وقد عصمه الله وطهره وآتاه رشده من قبل۔

(تفسیر خازن)

بعض لوگوں نے کہا کہ یہ واقعہ ایک قسم کے تحیر و تردد پر دلالت کرتا ہے جو تمام حجت اور بلوغ کے پہلے صغر سنی ہی میں ہو سکتا ہے جیسا یہ واقعہ قبل بلوغ کا ہے لیکن یہ قول نہ کسی طرح درست ہے اور نہ ہی قابل قبول اس لئے کہ انبیاء کرام علیہم السلام ہر حالت میں معصوم ہوتے ہیں ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ خدا کا کوئی رسول ہو جس پر ایک لمحہ کا بھی وقت گزر جائے کہ وہ خدا کی الوہیت کا قائل نہ ہو۔ عارف باللہ ہوتا ہے۔ خدا کی ذات کے ہر ذات ماسوا سے بری ہوتا ہے۔ پھر حضرت ابراہیم کے متعلق یہ بات کیا وہم بھی کیا جا سکتی ہے جب کہ خدا نے انہیں معصوم اور گناہوں سے پاک بنایا ہے اور ان کو ہدایت بھی پہلے ہی عطا کر دی ہے۔

اسی طرح علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ اس نظریے کا ابطال کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

وزعم انه عليه السلام قال ما قال ان لم يكن عارفا بربه سبحانه والجهل حال الطفولية قبل تمام الحجة لا يضره ولا يعد ذلك كفرا مما لا يلتفت اليه فقد قال المحققون انه لا يجوز ان يكون لله رسول يأتي عليه وقت من الاوقات الا وهو لله موحد وبه عارف ومن كل معبود سواه برئ

(روح المعانی صفحہ ۱۹۶ ج ۷)

اور یہ گمان کرنا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو کچھ کہا تھا وہ اس وقت کہا تھا جب کہ وہ اپنے رب سبحانہ تعالیٰ کو پہچانتے نہ تھے اور کم سنی میں تمام حجت کے پہلے جہالت مضر نہیں ہے لہٰذا اس وقت کی یہ بات کفر نہیں سمجھی جائے گی تو یہ خیال کسی طرح بھی اس قابل نہیں کہ اس پر دھیان دیا جائے کیونکہ محققین علماء تصریح کر چکے ہیں کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اللہ کا کوئی ایسا رسول ہو جس پر ایک لمحہ کا وقت بھی گزر جائے مگر یہ کہ وہ خدا کی توحید کا قائل ہوتا ہے۔ عارف باللہ ہوتا ہے اور خدا کی ذات کو ہر معبود باطل سے بری جانتا ہے۔

تفسیر خازن اور روح المعانی کے ان حوالوں کے سامنے آجانے کے بعد

حقیقت بے غبار ہو جاتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قول کو ستاروں کی الوہیت کے واقعی اور نفس الامری اقرار کے ساتھ واقعہ کو بلوغ کے قبل بتانا یا توحید کے معاملہ میں حضرت ابراہیمؑ کی طرف زمانہ بلوغ کے پہلے بھی کسی تحیر و تردد کی نسبت کرنا بالاتفاق تمام محققین اہلسنت کے نزدیک باطل ہو جاتا ہے کہ سن شعور کے بعد شرک یا تحیر و تردد اور توحید کے بارے میں کسی شک کی نسبت حضرت ابراہیمؑ کی طرف کرنا جیسا کہ مودودی صاحب نے کیا ہے یہ احتمال تو کسی طرح درست ہو ہی نہیں سکتا اگرچہ مذکورہ الصدر حوالوں کے بعد اور کسی ثبوت کی حاجت باقی نہیں رہ جاتی ہے لیکن ناظرین کے اطمینان کے لئے مزید ایک تفسیر کا حوالہ درج کیا جاتا ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

والصحیح هو القول الاول اذ لا یجوز ان یکون لله رسول یأتی علیہ وقت من الاوقات الا وهو لله موحد وبہ عارف ومن کل معبود سواه بری ۔

قول اول ہی صحیح ہے یعنی یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام الزام قائم کرنے کے لئے ادعاء اخبار اور مجاراۃ مع الخصم کے طور پر ستاروں کی الوہیت کا اقرار کیا تھا، اس لئے کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اللہ کا کوئی رسول ہو جس پر ایک لمحہ کا وقت گذر جائے مگر یہ کہ وہ خدا کی وحدانیت کا قائل عارف باللہ

(تفسیر مظہری صفحہ ۳۴) جاتا ہے، وہ خدا کی ذات کو بھول بیٹھ جاتا ہے

مودودی صاحب کا آخری مغالطہ اور اس کی حقیقت

مولانا مودودی صاحب کی تفسیر کے حوالے سے جو عبارت گذر چکی ہے اس کے آخری جملے یہ ہیں "تحقیق کی منزلیں جویائے حق کے لئے ناگزیر ہیں ان پر ٹھہرنا بسلسلۂ طلب و جستجو ہوتا ہے نہ کہ بصورت فیصلہ۔ اصلاً یہ ٹھہراؤ سوالی اور استفہامی ہوا کرتا ہے نہ کہ حکمی۔ طالب جب ان میں سے کسی منزل پر رک کر کہتا ہے "ایسا ہے" تو یہ دراصل اس کی آخری رائے نہیں ہوتی بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ "ایسا ہے؟" اور تحقیق سے اس کا جواب نفی میں پا کر وہ آگے بڑھ جاتا ہے اس لئے یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ اثنائے راہ میں جہاں جہاں وہ ٹھہرتا رہا وہاں وہاں وہ عارضی طور پر کفر و شرک میں مبتلا رہا" (تفہیم القرآن صفحہ ۵۶۹)

ان سطروں میں مودودی صاحب دراصل یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ جو کچھ اس موقع پر میں نے لکھا ہے یا جو دوسرے مفسرین نے بھی اس جگہ لکھا ہے فرق صرف انداز تعبیر کا ہے ورنہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قول "ہذا ربی" کو استفہام پر مفسرین نے محمول کیا ہے اور یہی بات میں کہنا چاہتا ہوں اس لئے یہ چیز نہایت ضروری ہو جاتی ہے کہ ناظرین کو مودودی صاحب کے فریب سے باخبر کرنے کے لئے اس کی اصل حقیقت واضح کر دی جائے

بنابریں سب سے پہلے اس احتمال کی توضیح ضروری ہے جو اس جگہ بعض مفسرین نے تحریر فرمایا ہے وہ یہ ہے علامہ خازن لکھتے ہیں ۔

الوجه الثاني أن إبراهيم عليه السلام قال هذا القول على سبيل الاستفهام وهو استفهام إنكار وتوبيخ لقومه تقديره أهذا ربي الذي تزعمون . . . . . والمعنى أيكون هذا ربا ودلائل النقص فيه ظاهرة (تفسير خازن صفحہ ۲۰)

دوسری توجیہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ جملہ بطور استفہام کہا تھا اور یہ استفہام اپنی قوم پر انکار و توبیخ کے لئے تھا اصل عبارت یہ ہے کیا یہی میرا رب ہے جس کا تم دعویٰ کرتے ہو . . . . معنی یہ ہوئے کہ کیا یہ رب ہو سکتا ہے جبکہ اس کے اندر نقص و عیب کے آثار بالکل ظاہر ہیں؟

مفسرین کی پیش کردہ توجیہ کا حاصل یہ ہوا کہ اس قول میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں کی الوہیت کا اعتراف و اقرار کیا ہی نہیں ہے وہ تو خدا کی الوہیت کے بہت پہلے ہی سے قائل تھے یہ بات ان کے اندر ممکن ہی نہیں ہو سکتی کہ وہ خود حصولِ علم کی غرض سے غور و فکر یا کوئی سوال و استفہام کریں بلکہ اپنی قوم کے عقیدہ کو رد کرنے کے لئے انھوں نے ستاروں میں غور و فکر کرنے کے بعد چونکہ ان کی عدم الوہیت کے دلائل واضح تھے اس لئے اپنی قوم پر الزام عائد کرتے ہوئے بطور زجر و توبیخ ان سے کہا

کیا تمہارے گمان کے مطابق یہی میرا رب ہے جس کے اندر زوال کے آثار بالکل ظاہر ہو رہے ہیں یعنی وہ رب کیوں کر ہو سکتا ہے جو فانی اور زوال پذیر ہے۔ پس معلوم ہو گیا کہ مفسرین کے تحریر کردہ استفہام کا یہ منشا نہیں ہے کہ نعوذ باللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی پہلے سے خدا کی الوہیت کا علم حاصل نہ تھا یا وہ اس معاملہ میں تردد و تحیر یا کسی شک میں مبتلا تھے اور ان کا یہ قول حصول علم اور آخری فیصلہ کرنے سے پہلے کسی درمیانی مرحلہ کا عارضی اعتراف و اقرار ہے جیسا کہ مودودی صاحب سمجھانا چاہتے ہیں مفسرین نے استفہام کو انکار و توبیخ پر محمول کیا ہے نہ کہ استفہام طلب و سوال پر۔ استفہام انکاری کا مطلب ہے مخاطب کے معلوم نظریے کا باطل کرنا اور اس کے تسلیم کرنے سے انکار کرنا اور استفہام سوالی یا طلبی کا مطلب ہے کسی غیر معلوم چیز کا دریافت و معلوم کرنا اور اس کی تحقیق و جستجو کرنا دونوں کے درمیان بہت بڑا فرق ہے جو کچھ مفسرین نے تحریر کیا ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ابراہیم علیہ السلام کی طرف ستاروں کی الوہیت کا عقیدہ یا کفر و شرک کی نسبت اثنائے راہ میں عارضی ہی طور پر سہی ایک لمحہ کے لئے بھی درست ماننے کی ضرورت پیش آئے اس کے برخلاف یہ چیز مودودی صاحب کی اختیار کردہ راہ کے لئے بالکل ناگزیر ہو جاتی ہے۔ باقی مودودی صاحب کا یہ کہہ دینا کہ وہ عارضی اور اثنائے راہ کی بات ہے آخری فیصلہ

نہیں ہے لہٰذا کوئی مضائقہ نہیں یہ تو خود ان کے ذہن کی بات ہے ورنہ
علامہ آلوسی وغیرہ کے حوالے سے گذر چکا ہے کہ سن شعور کے بعد تو یہ چیز
بڑی بات ہے صغر سنی اور کم عمری میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف
اس کی نسبت ہرگز درست نہیں ہے۔

انبیاء کرام پر نفس یا شیطان کا کبھی غلبہ نہیں ہوتا

یہ چیز اپنی جگہ مسلم ہے کہ ہر انسان
کے ساتھ دو ازلی دشمن لگے ہوئے ہیں جن سے کوئی فرد بشر خالی نہیں ہے
ان میں سے ایک دشمن داخلی ہے اور ایک خارجی اور یہی دونوں درحقیقت تمام
شر و فساد کا سرچشمہ ہیں یہ نفس اور شیطان ہیں اگرچہ یہ دونوں ہی انبیاء کرام
علیہم السلام کے اندر بھی موجود رہتے ہیں اور کسی حد تک ان کے طبعی تقاضے
بھی موجود ہوتے ہیں لیکن قدرت ابتدا ہی سے انبیاء کرام علیہم السلام کے لئے
ایسا نظم کرتی ہے کہ ان دونوں کا بالکل مزاج ہی بدل جائے یا کم سے کم ان
کے ہتھکنڈوں سے انبیاء کرام کو محفوظ رکھا جائے اس لئے ان پر نفس یا شیطان
کا کوئی داؤ کامیاب نہیں ہو پاتا۔ کتاب و سنت کے ساتھ انبیاء کرام کے حالات
میں غور کرنے سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ان دونوں میں سے کسی
کا بھی ان پر غلبہ نہیں ہو پاتا ہے اس بات کا ثبوت کہ شیطان کا ان پر کبھی غلبہ
نہیں ہو سکتا ذیل کی حدیث کے اندر موجود ہے

عن ابن مسعودؓ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم مامنکم من احد الّا وقد وکل بہ قرینہ من الجن وقرینہ من الملئکۃ قالوا و ایاک یا رسول اللّٰہ قال ایای ولکن اللّٰہ اعانني علیہ فاسلم فلا یامرني الا بخیر ۔

(مشکوٰۃ ص ۱۸ ج ۱)

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہر شخص کے ساتھ یہ بات پیش آتی ہے کہ اس کا ایک ساتھی شیطان مقرر کیا جاتا ہے اور ایک ساتھی فرشتہ مقرر ہوتا ہے صحابہ کرامؓ نے دریافت کیا یا رسول صلی اللہ علیہ وسلم یہ معاملہ آپ کے ساتھ بھی پیش آیا ہے، حضورؐ نے فرمایا ہاں میرے ساتھ بھی لیکن اللہ تعالی نے مجھے اس پر غالب کر دیا اس لئے وہ شیطان مطیع ہو گیا پس وہ مجھے صرف اچھے کاموں کا ہی حکم دیتا ہے۔

حدیث میں اس بات کی کھلی تصریح ہے کہ یہ شیطان انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کا ہمزاد وقرین ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود اللہ تعالی انبیاء کرامؑ کو اس کے شر سے محفوظ کر دیتے ہیں بلکہ حد تک ان کا مطیع و فرماں بردار

یہ حدیث مختلف صحابہؓ سے ان کتابوں میں بھی روایت کی گئی ہے مسلم، نسائی، ترمذی، دارمی، احمد، طبرانی، کبیر ابو یعلی سعید ابن منصور ابن حبان بغوی دیکھئے تنقیح الرواۃ و مرعاۃ مرقاۃ

بنا دیا جاتا ہے اور اغوا و اضلال کے بجائے اچھے کاموں میں اپنی فطرت کے خلاف تعاون کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اس حدیث میں مطیع و فرماں بردار بنائے جانے کے سلسلے میں کسی وقت کا تعین نہیں کیا گیا جس سے بظاہر یہی واضح ہوتا ہے اس اطاعت و فرماں برداری کا آغاز ابتدا سے ہی ہو جاتا ہے اور اس کے شر سے حفاظت و عصمت کا سلسلہ انبیاء کرامؑ کے ولادت کے بعد ہی شروع ہو جاتا ہے اس خیال کی تائید ان رواتیوں سے بھی ہوتی ہے جن کے اندر فَاَسْلَمَ صیغہ ماضی کے بجائے فَاَسْلَمُ صیغہ مضارع وارد ہے بلکہ بعض اہل علم نے اس صورت کو زیادہ بہتر قرار دیا ہے بعض علماء نے قاضی عیاض مالکی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے امت کے اس اجماعی عقیدہ کی تصریح کی ہے۔

ان الامة مجتمعة علی عصمة النبی صلی الله علیه وسلم من الشیطین فی جسمه و خاطره ولسانه۔

(مرقاۃ ص ۸۸، ج ۱)

ساری امت اس بات پر متفق ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جسم، اپنے قلب اور اپنی زبان میں شیطان کے اثر سے محفوظ رکھے گئے ہیں۔

دوسرا دشمن نفس ہے یہ بھی ہر انسان کی طرح انبیاء کرامؑ کے اندر موجود ہوتا ہے اور کسی حد تک اپنی فطرت کے تحت کبھی کبھی شرارت کرنا چاہتا ہے لیکن شیطان ہی کی طرح اللہ تعالیٰ انبیاء کرامؑ کی اس سے بھی حفاظت

فرماتے ہیں اور یہ ہمیشہ اپنے داؤں میں ناکام رہتا ہے۔ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ایک پیغمبر کی زبان سے یہ اقرار بھی نقل فرمایا ہے۔

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ؕ

(نفس بلاشبہ برائی کا حکم دینے والا ہے لیکن میرا رب جب رحم فرماوے (وہ اس کے شر سے محفوظ ہو جاتا ہے)

اس آیت کے اندر یوسف علیہ السلام کے اقرار کے تحت جہاں اس بات کی صراحت ملتی ہے کہ نفس انبیاء کرام علیہم السلام کے اندر بھی پایا جاتا ہے اور وہ امارہ بالسوء بھی ہوتا ہے وہاں اسی آیت کے اندر اس بات کی طرف بھی تصریح پائی جاتی ہے کہ خداوند تعالیٰ کی رحمت ان انبیاء کرام علیہم السلام کی نفس کے مقابلہ میں ہمیشہ دستگیری کرتی ہے اور نفس اپنے داؤں میں کبھی کامیاب نہیں ہو پاتا۔ اللہ تعالیٰ اس کے شر سے انبیاء کرام علیہم السلام کو محفوظ رکھتے ہیں چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں۔

آنکہ انبیاء کرام علیہم السلام در اخلاق جبلیہ خود فوقیت دارند بر غیر خویش این نیز امر بدیہیات ملت است و کسیکہ بنوامیس حکمت خلقیہ مطلع است

(یہ بات کہ انبیاء علیہم السلام اپنے فطری اخلاق میں غیروں پر فوقیت رکھتے ہیں تو یہ مسئلہ بھی مذہب کے بدیہی مسائل میں سے ہے اور جو شخص بھی تخلیقی حکمت کے اصول و راز سے واقف ہو

بلکہ بہ صورت می داند کہ انتظام اخلاق جمیلہ بایں روش کہ ذوات انبیاء را بر سرشتہ بدون انقیاد نفس قلب را و قلب عقل را میسر نیست۔ (ازالۃ الخفا صفحہ)

یا یہ بداہت اس بات کو جانتا ہے کہ جیسا ورنہ یہ اخلاق انبیاء کرام میں ظہور پذیر ہو ہیں ان کی ذوات سے ان اخلاق جمیلہ کا منتظم ہو جانا نفس کی اطاعت قلب اور قلب کی اطاعت عقل کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

شاہ صاحب کی اس تصریح سے معلوم ہوا کہ انبیاء کرام کا نفس ان کے قلب کے تابع ہوتا ہے اور ان کا قلب عقل کے تابع ہوتا ہے اس لئے ان کا ہر عمل عقل کے تقاضے کے مطابق ہوتا ہے۔

عصمتِ انبیاء سے متعلق مودودی صاحب کی دوسری کوتاہیاں

مودودی صاحب کی عبارت کا جو اقتباس ناظرین کے سامنے پیش کیا گیا تھا اس کے پہلے جملے پر مکمل تحقیقی بحث گذشتہ صفحات میں پیش کی گئی ہے جس کے ذیل میں مسئلہ کے تقریباً ہر پہلو پر روشنی پڑ چکی ہے لیکن دوسرے جملوں کے اندر مودودی صاحب کی جو خامیاں ہیں ان کی نشاندہی ابھی باقی ہے اس لئے ان پر کلام کرنا بھی ضروری ہے اگرچہ اس موقعہ پر ہم بے حد اختصار سے کام لیں گے۔

مودودی صاحب کی زیرِ نظر عبارت کا دوسرا جملہ یہ تھا

"ورنہ اگر اللہ تعالیٰ کی حفاظت تھوڑی دیر کے لئے بھی ان سے منفک ہو

جائے تو جس طرح عام انسانوں سے بھول چوک اور غلط فہمی ہو جاتی ہے اسی طرح انبیاء علیہم السلام سے بھی ہو سکتی ہے۔

انبیاء کرامؑ کے بارے میں یہ خیال کہ وہ کسی وقت عام انسانوں کی طرح غیر معصوم ہو سکتے ہیں بہت ہی خطرناک قسم کی غلطی ہے، عام انسان تو غیر معصوم ہونے کی وجہ سے بھول چوک اور غلط فہمی میں بڑے بڑے گناہ کا ارتکاب کر لیتے ہیں حتیٰ کہ ان سے کفر و شرک کا صدور بھی ہو جاتا ہے کیا انبیاء کرام علیہم السلام سے بھی مودودی صاحب کے خیال کے مطابق غیر معصوم ہو جانے کی صورت میں یہ سب کچھ ہو سکتا ہے، اگر ہو سکتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے کسی قول و عمل کو سند نہ بنایا جائے کیونکہ اس صورت میں ان کے ہر قول و عمل کے متعلق اس بات کا احتمال ہوگا کہ وہ عصمت کے منفک ہو جانے کے وقت ہی صادر ہوا ہو حالانکہ صحابہ کرامؓ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر قول و عمل کو دلیل خصوص نہ ہونے کی صورت میں بغیر کسی تامل و تاخیر کے اپنا لینا اس نظریے کی قطعی نفی کرتا ہے در حقیقت یہ امکان نبی کی ذات سے وثوق و اعتماد ہی کو متزلزل کر دیتا ہے بلکہ اس احتمال کو درست مان لینے کے بعد پورے دین سے ہی بے اعتمادی پیدا ہو جائے گی اس لئے کہ سارے اعتماد و وثوق کی بنیاد ہی نبی کی ذات کے معصوم و محفوظ ہونے پر قائم ہے انکی عصمت و حفاظت ختم ہو جانے کے بعد جو عام انسانوں کے اعمال و اقوال کا حال ہے

وہی حال ان کا بھی ہو جاتا ہے جس کے بعد کسی اعتماد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مسئلہ کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے علامہ عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

لو جوز هذا الامر لما بقي الامان في امر التبليغ وهو ظاهر (فواتح الرحموت ص ۳۸۷)

اگر اس صورت کو درست مان لیا جائے تو شریعت کے معاملے میں اعتماد ہی ختم ہو جائے گا حالانکہ یہ بات جس قدر خطرناک ہے وہ ظاہر ہے۔

پس معلوم ہوا کہ اس موقع پر زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ عصمت کے منفک ہوئے بغیر انسانی فطرت کے تقاضوں کے تحت انبیاء کرام علیہم السلام سے کسی وقت کسی لغزش کا ہونا ممکن ہے لیکن من جانب اللہ ان کو تنبیہ کر دی جاتی ہے اور اس پر ہرگز قائم نہیں رہنے دیا جاتا مگر یہ خیال کہ ان کی عصمت ہی ختم ہو جائے اور عام انسانوں کے درمیان اور ان کے درمیان کوئی فرق باقی نہ رہے یہ بہت خطرناک قسم کی بات ہے اس جگہ ناظرین کو شبہ نہ ہونا چاہئے کہ مودودی صاحب نے تو اگر اللہ تعالیٰ کی حفاظت تھوڑی دیر کیلئے بھی ان سے منفک ہو جائے تحریر فرمایا ہے جو فرض محال کے درجے کی بات ہے نہ کہ لازمی طور پر فی الواقع یہ چیز مودودی صاحب کی خیال میں ہو جاتی

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں انا لو جوزنا عليهم شيئا من ذلك بطلت الشرائع ولم يوثق بشئ مما يذكرون انه من وحي الله تعالى روح المعاني ص ۲۲۔

کوئی ضروری بات ہے یہ شبہ اس لئے غلط ہے کہ مودودی صاحب نے اگلے جملے
میں خود ہی اس کی بھی تصریح کردی کہ یہ بات فرض محال کے درجے کی نہیں ہے بلکہ
ان کے خیال میں یہ معاملہ ہر نبی کے ساتھ کبھی نہ کبھی ضرور واقع ہوتا ہے بنا بریں
اب کسی توجیہ کے لئے بھی مودودی صاحب کے کلام میں کوئی گنجائش باقی نہیں
رہ جاتی وہ خود فرماتے ہیں۔

۳ اور یہ ایک لطیف نکتہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بالارادہ ہر نبی سے کسی نہ کسی
وقت اپنی حفاظت اٹھا کر ایک دو لغزشیں سرزد ہونے دی ہے۔

اس جگہ مودودی صاحب صرف لغزش کا ہونا ہی تحریر فرماتے تو بات
کسی طرح بن سکتی تھی مگر اس صورت میں نہ یہ لغزش عصمت کے منافی سمجھی جاتی
اور نہ اس کی وجہ سے عصمت وحفاظت اٹھانے کی ضرورت پیش آتی ہے
کیونکہ جن بزرگوں نے کسی لغزش کا وجود انبیاء سے جائز مانا ہے انہوں نے
اس کو عصمت کے منافی نہیں سمجھا ہے ورنہ وہ بھی مودودی صاحب کی طرح
عصمت کے اٹھائے جانے کی تصریح ضرور کرتے لیکن ایسا کسی نے نہیں کیا
ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لغزش ان کے یہاں اس درجے کی چیز ہی
نہیں ہوئی کہ اس سے انبیاء کرام کی عصمت کے متاثر ہو جانے کا اندیشہ ہو
مگر مودودی صاحب کے نزدیک یہ لغزش اس درجہ خطرناک ہوتی ہے
کہ ان کے لئے عصمت کا اٹھا دیا جانا بھی ضروری ہے حالانکہ زمانہ نبوت

میں عصمت و حفاظت کے زوال و انفکاک کا یہ نظریہ اجماعِ امت کے خلاف ہے
اور سلبِ عصمت کے اس عقیدے کا مودودی صاحب کے علاوہ کسی دور میں
بھی امت کے اندر کہیں سراغ نہیں ملتا ہے گذر چکا ہے کہ عصمت نبوت کے
ممتاز اجزا میں سے ایک جز ہے، جز کا اپنے کل سے منفک ہوتا کیونکر ممکن
ہے۔ اخیر میں یہ بات بھی ذہن نشین رہ چاہئے کہ لغزش یا بھول چوک کا
واقع ہونا۔ اسی طرح اس پر باز پرس اور مواخذہ کا ہو جانا اس بات کی دلیل
ہے کہ جس مخلوق سے یہ لغزش صادر ہوئی یا جس کا اس پر مواخذہ کیا گیا ہے
وہ ضرور بندہ و محکوم ہے اس لئے اگر محکوم نہ ہوتی تو اس سے مواخذہ کیوں
ہوتا لیکن یہ چیز اس بات کی دلیل نہیں بن سکتی کہ وہ مخلوق بشر یا انسان ہے
اس فرق کو ایک مثال سے واضح کیا جا سکتا ہے مثلاً کسی فرشتہ یا جن سے
کوئی ایسا فعل صادر ہو گیا کہ جس پر ان سے باز پرس کی گئی تو یہ چیز اس بات
کی واضح دلیل ہوگی کہ جن یا فرشتہ ضرور کسی کا بندہ اور محکوم ہے ورنہ اس کی
باز پرس ہی کیوں ہوتی اس کے برخلاف یہ باز پرس یا لغزش اس بات کی
دلیل نہیں بن سکتی کہ وہ جن یا فرشتہ بشر اور انسان ہے۔ مطلب یہ ہے
کہ لغزش کا واقع ہونا یا اس پر باز پرس ہونا بشر ہونے کی دلیل نہیں
بنایا جا سکتا البتہ بندہ و محکوم ہونے کی دلیل اس کو بنایا جا سکتا ہے اس
فرق کو سمجھ لینے کے بعد مودودی صاحب کے اس استدلال کی کمزوری کسی

بیان کی محتاج نہیں رہ جاتی۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ انبیاء کرام سے

یہ لغزش اس لئے ہوتی ہے

یہ "تاکہ لوگ انبیاء علیہم السلام کو خدا نہ سمجھیں اور جان لیں کہ یہ بشر ہیں

خدا نہیں ہیں۔"

کسی لغزش کے واقع ہونے سے یہ تو سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ خدا نہیں ہیں لیکن یہ کیونکر سمجھا جائے گا کہ وہ بشر ہیں کوئی دوسری مخلوق مثلاً جن یا فرشتہ نہیں ہیں البتہ یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ محکوم اور بندہ ہیں بالخصوص اس صورت میں جب کہ اس لغزش پر بازپرس بھی ہو جائے۔ بنا بریں مودودی صاحب کا استدلال لغزش کے صادر ہو جانے سے بشر ہونے پر ہرگز درست نہیں ہے، اس وضاحت کو سامنے رکھنے کے بعد مودودی صاحب کی مذکورہ بالا عبارت کے درمیان اور حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ کی اس عبارت کے درمیان فرق کر لینا کوئی دشوار کام نہیں ہے۔

کبھی کبھی انبیاء علیہم السلام سے بعض معاملات میں زلّت (لغزش) ہونے کے جو واقعات قرآن کریم میں مذکور ہیں وہ بھی عین حکمت و رحمت ہیں۔ ان میں ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ لوگوں کو انبیاء کی خدائی کا وہم و شبہ نہ ہونے پائے۔ زلّات کا صدور اور حق تعالیٰ کی تنبیہات واضح کر دیتی ہیں کہ حضرات انبیاء بھی اللہ تعالیٰ کے بندے ہی ہیں (مجالس مبارکہ بحوالہ صدائے حق صفحہ)

خیال رہے کہ دونوں عبارتوں کے درمیان اس کے علاوہ ایک واضح فرق اور بھی ہے وہ یہ کہ مودودی صاحب کے نزدیک لغزش کے صدور کے لیے عصمت کا اٹھایا جانا بھی ضروری ہے اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت میں اس قسم کی کوئی بات مذکور نہیں ہے۔

سید طاہر حسین گیاوی

اللہم امنحنا العصمۃ فی الاعمال والاقوال ونعوذ بک وصیانۃ عن الزلل والمیل الی الضلال وتوفق لنا بما تحب وترضی وتجعلنا من المعصومین وعبادک المحبوبین والحمد للہ رب العالمین۔

تمت ــــــــ بالخیر ــــ

فہرست مآخذ و مراجع

۱	قرآن حکیم	۱۴	سیر مائۃ	۲۷	فواتح الرحموت
۲	صحاح ستہ	۱۵	نووی شرح مسلم	۲۸	الملل والنحل
۳	مشکوٰۃ المصابیح	۱۶	شرح عقائد	۲۹	حاشیہ مشکوٰۃ
۴	تفسیر روح المعانی	۱۷	مسامرہ	۳۰	ما لابد منہ
۵	تفسیر ابن کثیر	۱۸	شرح فقہ اکبر	۳۱	ستاناوی بمالابد منہ
۶	تفسیر مدارک	۱۹	نبراس	۳۲	تفہیم القرآن
۷	تفسیر خازن	۲۰	حاشیہ نبراس	۳۳	تفہیمات ۲
۸	تفسیر عزیزی	۲۱	الاعتقاد الصحیح	۳۴	رسائل و مسائل ۱
۹	تفسیر مظہری	۲۲	الروضۃ البہیہ	۳۵	تحریک اسلامی
۱۰	تفسیر صادی	۲۳	ازالۃ الخفاء	۳۶	حاشیہ نفحات تکمیل
۱۱	مرقات	۲۴	حجۃ اللہ البالغہ	۳۷	ترجمان القرآن
۱۲	لمعات	۲۵	احیاء العلوم	۳۸	شرح مواقف
۱۳	اشعۃ اللمعات	۲۶	مسلم الثبوت	۳۹	تفسیر کبیر

خطوط نویسی

عربی، انگلش اور اُردو میں

تالیف : بدر الزماں قاسمی کیرانوی

عربی، انگلش اور اردو میں خط وکتابت سکھانے والی اپنی نوعیت کی منفرد اور بے مثال کتاب۔ جس میں سو سے زیادہ مختلف مواقع پر لکھے جانے والے خطوط اور ملازمت کے لیے دی جانے والی درخواستوں، نیز دفتری اور تعلیمی خط وکتابت کے نمونے پیش کیے گئے ہیں اس کے علاوہ خط وکتابت سے متعلق ضروری الفاظ، اصطلاحات اور تعبیرات کا ایک بڑا ذخیرہ تینوں زبانوں میں جمع کر دیا گیا ہے۔

اس سے قبل مؤلف کی ایک کتاب "جدید عربی ایسے بولیے" خراج تحسین حاصل کر چکی ہے۔

یہ کتاب بھی اہلِ ذوق حضرات کے لیے ایک انمول تحفہ ہے۔ قیمت =/70 روپے

فہرست کتب مفت طلب فرمائیں

کتب خانہ نعیمیہ دیوبند

PRINT ART Delhi Ph. & Fax 23634222